انتساب

یوں تو اس کتاب کے موضوع کا تقاضا ہے کہ یہ ان تمام کارکنوں کے نام منسوب کی جائے جو بالعموم کارِ سیاست میں ملوث ہیں یا شوق رکھتے ہیں اور بطور خاص جو آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے کارکن ہیں۔ شاید اس کتاب کی کوئی بات ان کے کام آ جائے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ جماعتی کارکنوں کے علاوہ میرے بیٹوں میں سے سردار عتیق احمد خان (موجودہ وزیراعظم آزاد کشمیر) اس بات کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کہ یہ کتاب انہی کے نام سے منسوب کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میں ان کے اندر بعض ایسی باتیں دیکھتا ہوں جن کا میں نے اس کتاب میں ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ عتیق احمد خان کو اور ہمارے قارئین کو جہاں بھی وہ ہوں توفیق دے کہ وہ اس کتاب سے استفادہ کر سکیں۔ آمین ثمّ آمین!

اچھی حکمرانی

(Good Governance)

سردار محمد عبدالقیوم خان

جملہ حقوق بحق سردار عتیق احمد خان محفوظ ہیں

نام کتاب: اچھی حکمرانی (Good Governance)

مصنف: سردار محمد عبدالقیوم خان

زبان: اُردو

صفحات:

پبلشر:

کمپوزنگ: عبادت حسین، عبدالمجید صدیقی، حافظ محمد یونس، زبیر عباسی

پروفنگ: مولانا محمد یوسف، میاں کریم اللہ قریشی کرناہی، پروفیسر ظفر چوہدری
عبدالرشید عباسی ایڈووکیٹ (وزیر قانون و پارلیمانی امور)

بار: اوّل

تعداد: ۱۰۰۰

تاریخ اشاعت: فروری ۲۰۰۸ء

قیمت: ۲۰۰/- روپے

ترتیب عنوانات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
(الف):	تمہید	۲
(ب):	اچھی حکمرانی (Good Governance)	۷
(ج):	حکمرانی کے لیئے صلاحیت	۵۲
(د):	اچھی حکمرانی کے چند اصول	۶۴
۱:	بے غرض حکمرانی	۶۴
۲:	ذاتی پسند و نا پسند	۶۴
۳:	تنقید	۶۴
۴:	مطالعہ	۶۵
۵:	اہلِ علم کی مجلس	۶۵
۶:	سیکھنا اور علم میں اضافہ کرنا	۶۷
۷:	اخلاص	۶۸
۸:	تلاوت	۶۹
۹:	نماز	۶۹
۱۰:	یقین	۷۰
۱۱:	حجابات	۷۱
۱۲:	زبان	۷۱
۱۳:	نفس	۷۸
۱۴:	غصّہ	۷۹

۱۵: تکبّر ۸۱
۱۶: تجسّس ۸۳
۱۷: نرمی و سختی ۸۵
۱۸: صلہ رحمی ۸۶
۱۹: اعانتِ جُرم سے اجتناب ۹۳
۲۰: احتساب ۹۸
۲۱: سیاسی اخلاقیات ۹۹
۲۲: خود احتسابی ۹۹
۲۳: عصبیت ۱۰۰
۲۴: رشوت ۱۰۲
۲۵: خوشامد، چغلی، غیبت ۱۰۶
۲۶: وقت کی قدر ۱۱۴
۲۷: رسائی ۱۱۵
۲۸: عزّتِ نفس ۱۲۱
۲۹: سادگی ۱۲۲
۳۰: محنت اور وابستگی ۱۲۲
۳۱: سرکاری ملازمین اور سیاست ۱۲۹
(ر): معاشرے میں فرد کی اہمیت ۱۴۷
(س): اختتامیہ ۱۵۴
(ش): خلاصہ ۱۶۶

تمہید

اچھی حکمرانی کے عنوان پر کتاب تحریر کرنے کی میری خواہش اگرچہ بہت عرصے سے تھی لیکن سیاسی و سماجی مصروفیات کے باعث اس پر عمل میں تاخیر ہوتی چلی گئی اور پھر یہ کہ ہر کام کا اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ وقت سے پہلے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ موجودہ حکمرانوں کے متضاد طرز حکومت اور اکثر اصولوں پہ قائم نہ رہنے کے اطوار نے میری اس خواہش کو جلا بخشی جس کے نتیجے میں اس موضوع پر اس مختصر کتاب کی تحریر ممکن ہو گئی۔ اگرچہ زیرِنظر کتاب کے متن میں اس بات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے کہ ''اچھی حکمرانی'' یا اس کے مترادف کسی عنوان کے تحت ماضی میں کوئی جامع کتاب نہیں لکھی گئی اور جن حضرات نے کچھ لکھا بھی ہے تو اُن کا حکمرانی کے بارے میں اپنا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لہذا اُن کی تحریریں تشنہ ہیں کیوں کہ سمندر کی تہہ اور وہشت ناکیوں سے ایک غوطہ خور ہی بخوبی آشنا ہو سکتا ہے نہ کہ وہ شخص جو سمندر کے کنارے بیٹھا دُور سے اس کی لہروں کا تماشا دیکھ رہا ہو۔ پھر جس طرح ایک بڑھئی لوہار کے کام سے اور گلکار سُنار کے کام سے نا آشنا ہوتا ہے اسی طرح ایک عالم فاضل بھی کارِسیاست اور امورِ حکمرانی سے نا آشنا ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''حکیم وہ ہوتا ہے جس پہ خود بیتی ہو''۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے

نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک کارِسیاست اور حکمرانی میں رکھا اور اپنے فضل و کرم سے خود میری رہنمائی فرمائی اور توفیق بھی دی کہ میں حتی المقدور اپنے فرائض اپنے عقیدے کے مطابق انجام دوں۔ ہر شعبۂ زندگی میں کامیابی کی طرح کارِحکمرانی کے بھی دو اہم نکات ہیں جنھیں اصولی اور عملی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کارِحکومت میں اصول اگرچہ ہر ملک اور قوم کی اقدار اور ضروریات کے مطابق مختلف ہوتے ہیں تاہم وہ لگے بندھے ہوتے ہیں جن پر صحیح طور پر عمل کر کے ہی کارِحکومت کو بطریق احسن انجام دیا جا سکتا ہے۔ حکمرانی میں نقص یا خلل اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب اصول اور عمل میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے۔ عام زندگی میں جب ہم قول کی بات کرتے ہیں تو وہ قول عام طور پر تحریری صورت میں نہیں ہوتا بلکہ تقریری صورت میں ہی ہوتا ہے لیکن درحقیقت اُس سے بھی متکلّم اپنے لیئے ایک اصول وضع کر دیتا ہے جس کا پاس اُس پر لازم ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے قول سے پھر جاتا ہے تو اس کو تضاد بیانی کہا جاتا ہے جس کو ہر مذہب و ملّت میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ حکمران کے اصول تحریری صورت میں ہوں یا تقریری صورت میں ان کا پاس حکمران پر بہرصورت واجب ہوتا ہے۔ تاریخ کی کتب ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں جن سے سیاسی شعور رکھنے والے یا کارِحکمرانی پر نظر رکھنے والے اکثر حضرات واقف ہوں گے لیکن میرے مشاہدے اور تجربے میں کارِحکمرانی کے دوران بار ہا یہ بات آئی ہے کہ اصول پر عمل کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ حالانکہ دیانت کا تقاضا بہرصورت یہی ہے۔ کچھ بھی ہو اصولوں پر کبھی سودا بازی نہیں ہونی چاہیئے ورنہ اچھی حکمرانی کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ اصول پر عمل میں پیش آنے والی مشکلات کے باوجود اصول کی پاسداری میں عملی تجربات میں سے یہاں ایک واقعہ نقل کر کے بات کو آگے بڑھاتا ہوں اور وہ یہ کہ:

۱۹۴۸ء کے جہاد کے دران ہمیں محاذ پر ''پیر کنٹھی'' کے مقام پر شکست ہو گئی۔ چونکہ پیر کنٹھی بلندی پر تھی اور ہم نشیبی طرف تھے اس لیئے یہ ناقابلِ تسخیر لگتی تھی۔ ہم نے دوبارہ وہ جگہ حاصل کرنے کے لیئے منصوبہ بنایا۔ حملہ کرنے سے پہلے جنگی حکمتِ عملی اور اصول کے تحت دشمن کی پوزیشن سے باخبر ہونے کے لیئے اور اُس علاقے کا جائزہ لینے کے لیئے ہم کچھ لوگ اُس جگہ کی طرف چل پڑے۔ جب قریب پہنچے تو دشمن نے فائر کھول دیا۔ ہم اِدھر اُدھر پتھروں اور درختوں کی اوٹ میں پناہ لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ جب فائر زیادہ تیز ہو گیا تو ہمارے قافلے میں شامل ایک کپتان صاحب نے کہا کہ چلو واپس چلتے ہیں۔ میں نے کہا کمانڈر کو کیا جواب دو گے۔ اُس نے گالی دے کر کہا کہ کمانڈر کی ایسی کی تیسی آپ دیکھتے نہیں ہیں آگے سے کس قدر فائر آ رہا ہے اور پھر ہمیں نیچے سے اوپر چڑھنا ہے کمانڈر یہاں گولی کے سامنے آ کر بتائے۔ چنانچہ وہ واپس چلا گیا اور ہم نے دشمن کے فائر کی پرواہ کیئے بغیر حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا کی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اصول پر عمل کرنے کے لیئے بعض اوقات جان کی پرواہ بھی نہیں کی جاتی اور اگر یقینِ محکم ہو اور نیت درست ہو تو اللہ تعالیٰ کی نصرت ضرور شامل ہوتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی ایسی ان گنت مہربانیاں دیکھی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں کئی باتیں اصولی بھی ہیں جن پر ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے اپنے مخلص اور نیک دل دوستوں کے تعاون سے ہمیشہ یہ بھی کوشش کی ہے کہ کارِسیاست کو اسلام کے ماتحت رکھیں۔ اگرچہ یہ بھی اصولی بات ہے لیکن ہم نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ایسا کر کے دکھایا ہے۔ اقبالؒ کے اس قول کے مصداق یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہی ہے کہ:

؎ جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ سیاست کو دین پر حاوی نہ ہونے دیا جائے۔ کیوں کہ جس زمین پر عمارت تعمیر کرنی ہو وہ اُس کے لائق ہونی چاہیئے ورنہ عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی اور اگر کھڑی ہو بھی جائے تو وہ اپنی کجی کے باعث اپنے مکینوں کے لیئے ہمیشہ خطرہ بنی رہتی ہے۔ ہم نے اپنی حکومت کو اسلامی حکومت کے بجائے مسلمانوں کی حکومت کہا تاکہ ہماری کسی غلطی کی وجہ سے اسلام بدنام نہ ہو۔

زیرِنظر کتاب میں ''تمہید'' اور ''اختتامیہ'' کے علاوہ ''اچھی حکمرانی''، ''حکمرانی کے لیئے صلاحیت''، ''معاشرے میں فرد کی اہمیت'' اور ''اچھی حکمرانی کے چند اصول'' جیسے اہم موضوعات کو اکتیس ذیلی عنوانات کے تحت زیرِ بحث لایا گیا ہے جو ہماری نظر میں کلی یا جزوی اعتبار سے کارِ حکومت اور سیاست سے متعلق ہیں۔ ان میں بے غرض حکمرانی، ذاتی پسند و نا پسند، تنقید، مطالعہ، اہلِ علم کی مجلس، سیکھنا اور علم میں اضافہ کرنا، اخلاص، تلاوت قرآن، نماز، یقین، حجابات، زبان، نفس، غصّہ، تکبر، تجسس، نرمی و سختی، صلہ رحمی، اعانتِ جُرم سے اجتناب، احتساب، سیاسی اخلاقیات، خود احتسابی، عصبیت، رشوت، ''خوشامد،چغلی،غیبت''، وقت کی قدر، رسائی، عزتِ نفس، سادگی، محنت اور وابستگی، نیز ''سرکاری ملازمین اور سیاست'' اہم موضوعات ہیں جن پر مفصل گفتگو کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس بات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ہر وہ بات اس کتاب میں شامل ہو جس سے موجودہ حکمرانوں اور سیاست سے وابستہ حضرات کو واسطہ پڑتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ زیرِ نظر کتاب موجودہ حکمرانوں، حکومتی اراکین، سیاست سے وابستہ حضرات اور سرکاری ملازمین کی صحیح سمت رہنمائی کرنے میں سودمند ثابت ہو گی۔ البتہ ضروری ہے کہ اُن کے دلوں میں اصلاح کا جذبہ، خوفِ خدا اور انسانیت کی محبت موجود ہو۔ میں زیرِنظر کتاب کی پروفنگ اور مواد کی ترتیب میں دستِ تعاون پر مولانا محمد یوسف حقانی صاحب، عبدالرشید عباسی صاحب (وزیر قانون آزادکشمیر)، میاں کریم اللہ قریشی کرناہی صاحب نیز اس کے کمپوزرز عبدالمجید صدیقی، عبادت حسین اور حافظ محمد یونس سمیت تمام دیگر رفقاء کے لیئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

اللہ تعالیٰ آپ اور ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین !

سردار محمد عبدالقیوم خان

راولپنڈی

۳۰/جنوری ۲۰۰۸ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

اچھی حکمرانی (Good Governance)

موجودہ دور میں ہمارے ہاں اچھی حکومت یا اچھی حکمرانی کا بہت چرچا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ تو اچھی حکومت کی کوئی مثال دی جاتی ہے، جس سے لوگ اس پر قیاس کریں نہ ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ اچھی حکمرانی کا مفہوم عملی دنیا میں کیا ہے۔ خود حکمران بھی اس سے بے خبر ہوتے ہیں کیونکہ ان کو یہ زعم ہوتا ہے یا دلایا جاتا ہے کہ وہ اپنے دور کے سب سے اچھے حکمران ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص اس کی اپنی اپنی تعبیر کرتا ہے۔ گویا اس طرح اچھی حکمرانی کی تعبیر تو ہو نہیں پاتی البتہ اپنی پسند ونا پسند کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ جس کے باعث ذہنی وفکری الجھاؤ میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ اس موضوع پر کسی معتبر ادارے کی طرف سے کسی سیمینار وغیرہ کے اہتمام کی کوئی کوشش بھی معلوم نہیں ہے۔ میں گزشتہ دنوں ڈیفنس کالج میں گفتگو کے دوران اس پر زور دیتا رہا ہوں مگر لگتا یہ ہے کہ اس پر دیانتداری سے گفتگو کی جائے تو شاید حکمرانوں کی ناخوشی کا باعث ہو یا یہ کہ اس حمام میں سب ہی چونکہ ننگے ہیں اس لیئے کسی خرابی کی نشاندہی ممکن نہیں۔ غالبًا اسی لیئے کسی ادارے نے اس پر کوئی متفقہ رائے قائم کرنے کی ابھی تک کوشش نہیں کی۔

کئی حضرات کا خیال ہے کہ ملک کی معاشی و اقتصادی حالت اچھی ہو تو یہ

اچھی حکمرانی ہو گی۔ بعض کا خیال ہے کہ ملک کی فوجی قوت اچھی حکمرانی کی علامت ہے۔ غرضیکہ اس کی کئی تعبیریں کی جاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی معاشرے کی اچھی معاشی حالت یقیناً باعثِ اطمینان ہے لیکن یہ حالت محض خیال یا محض خواہش کرنے سے تو اچھی نہیں ہو سکتی۔ یہ امر بھی نہ بھولے کہ معاشی حالت کی بہتری اپنے اندر خود بخود کچھ خرابیاں رکھتی ہے جس طرح معاشی حالت کی خرابی کے اپنے نقصانات ہیں جن سے بچنے کا راستہ اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ مگر اچھی معاشی حالت ایسی بیماری ہے کہ ہر شخص اس میں مبتلا ہونے کا خواہشمند ہے۔ یہ ایک بالکل ہی علیحدہ موضوع ہے اس لیئے اس پر اس وقت گفتگو مناسب نہیں ہے۔ صحت مندی کے ساتھ اگر بیماری کا خیال نہ رہے تو کسی وقت لا علاج بیماری سے ناگہانی طور پر سابقہ پڑ جاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انسان کی فطرت میں فساد کا عنصر موجود ہے اُس کے بارے میں اگر ساتھ ہی ساتھ اصلاحی اقدامات نہ کیئے جائیں تو اچھی معاشی حالت بھی دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ اقدامات اصولی طور پر بھی اور عملی طور پر بھی ہونے چاہئیں۔ عملی طور پر اس لیئے کہ ہر چیز میں خرابی کے جو اجزا فطری ہیں اُن کا علم اور پھر علاج یہ سب ایک ہی پیکج کا حصہ ہیں۔ بعینہ اسی طرح فوجی قوت ہے۔ اُس کے جہاں بہت سے فوائد ہیں وہیں اُس کی خرابیاں بھی ہیں۔ قوت جمع کرتے وقت اگر اُن کا خیال نہ رکھا جائے تو وہی قوت خود اپنی تخریب کی نذر ہو جاتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اچھی حکمرانی کا آخر معیار کیا ہو جس پر عوام و خواص اور بالخصوص وہ حضرات جو حکومت میں ہیں یا حکومت کا شوق رکھتے ہیں اس امر کو

پرکھیں کہ اچھی حکمرانی کیا چیز ہے۔ پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ ہم لوگ جب کسی معیار کی بات کرتے ہیں تو اس کو سب سے اوپر والے درجے سے شروع کرتے ہیں۔ بعض حضرات نے تو حد کر دی کہ ''زمین پر اللہ کی حکمرانی'' کو معیار بتایا۔ کچھ لوگوں نے رعایت کی اور کہا کہ نظام مصطفٰی ﷺ ہونا چاہیئے۔ غرضیکہ درجہ بدرجہ نہ جانے کتنے معیار بنا لیئے گئے۔ ستم یہ ہے کہ ان دعویداروں میں سے کسی کا اپنا کردار بلکہ سمجھ بھی ان کے دعوے کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس غلط کام کو ہی صحیح سمجھ کر اسے صحیح سمجھنے کی تلقین بھی کی جاتی ہے۔ اس طرح نہ تو اسلام کوئی معیار رہا اور نہ ہی غیر اسلام۔

اسلامی حکمرانی کے موضوع پر اگرچہ ہمارے مفکرین نے جن میں ابن تیمیہؒ، ابن خلدونؒ، شاہ ولی اللہؒ شاہ ہمدانؒ، اور مولانا مودودیؒ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں، حکومت اور حکمرانی پر بہت کچھ لکھا ہے مگر اس میں ایک غور طلب امر یہ ہے کہ ان حضرات گرامی میں سے کسی کو بھی ذاتی طور پر حکمرانی کا کوئی ادنیٰ سا تجربہ بھی نہیں تھا جب کہ کسی حکمران نے خود اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔ البتہ فن حکمرانی کے بارے میں اس فن کے دو مختلف فلسفوں کے بانیوں کا لکھا ہوا مواد مشہور ہے۔ ایک تو سیاست کا ابلیسِ اول پنڈت چانکیا ہے اور دوسرا میکاولی۔ چانکیائی سیاست کے پیروکار تو ہندوستان میں ہیں جب کہ میکاولی کے پیروکار یورپ اور یورپ سے متاثرہ ممالک میں ہیں۔ البتہ اسلامی سیاست کے پیروکار بہت کم حکمران ہیں۔ باوجودیکہ مسلمان حکمران کافی تعداد میں اس وقت بھی موجود ہیں۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ مفکر حضرات نے فلسفۂ حکمرانی تو بیان کردیا مگر اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ اگر ان بزرگوں میں سے کسی کو موقع ملتا تو شاید اس کا کچھ نقشہ بن جاتا مگر ایسا نہیں

ہوا۔ اس لیئے جو کچھ عملی دنیا میں ہو رہا ہے اس کی بناء پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کم سے کم معیار کیا ہونا چاہیئے جس پر اچھی حکمرانی کی تعمیر کی جا سکے۔ حکمرانی چونکہ زمانے اور عوام الناس کی ضرورت ہے اس لیئے اگر کوئی طے شدہ معیار نہ ہو تو افراتفری ہی اس کا نتیجہ ہو گا۔

دنیا میں معروف نقطہ نظر کے مطابق سب سے اچھی حکومت وہ ہے جس کے اراکین طے شدہ ملکی قوانین کی سختی سے پابندی کریں خواہ وہ قوانین کسی بھی شخص یا ادارے کے بنائے ہوئے ہوں فساد وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں کسی حکومت کے عاملین و اراکین اپنے ہی بنائے ہوئے ملکی ضابطوں کی خلاف ورزی شروع کر دیں۔یہیں سے بدنظمی شروع ہوجاتی ہے۔ خاص طور پر بڑے مرتبے والے حضرات جب خود کو قانون کا پابند نہیں سمجھتے تو وہ بدنظمی خود بخود نچلی سطح تک چلی جاتی ہے اور عوام کے دلوں سے بھی قانون کا احترام سرے سے اٹھ جاتا ہے اگر ہم اور کچھ نہیں کرسکتے تو اسی اصول پر سختی سے کار بند رہیں یعنی ملکی قوانین کی سختی سے پابندی کریں تو یقیناً اچھی حکمرانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔

اس مضمون میں ہم حکمرانی اور حکومت کے فلسفہ و حکمت اور اس کی تفصیلات پر بات کرنے کے بجائے اس کو اسی حد تک موقوف رکھیں گے کہ اس وقت عملاً کیا کچھ ہو رہا ہے اور اُس کو کیسے درست کیا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں میرا پختہ خیال یہ ہے کہ اگر بحیثیت مسلمان ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل نہ کرسکیں اور اپنے ہی بنائے ہوئے ملکی قوانین پر دیانتداری سے عمل کریں تب بھی اچھی حکمرانی کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ یہ فطری قانون افریقہ کے جنگلوں سے لے کر مہذب ترین دنیا تک سب کے لیئے یکساں ہے۔ اگر قوانین نہ

ہوں اور صرف رسم و رواج پر ہی سختی سے عمل کیا جائے تب بھی امن سے زندگی گزر سکتی ہے۔ کئی معاشروں میں محض رسم و رواج پر ہی کامیابی سے عمل ہو رہا ہے۔ اسلامی قوانین کا نفاذ تو شعوری نظم و ضبط کا تقاضا کرتا ہے جس کا حصول موجودہ دور میں نسبتاً مشکل ہے۔ اب سے چند دن پہلے اسلام آباد میں پولیس والوں نے ایک سائن بورڈ لگایا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا ''قانون کی نظر میں سب یکساں ہیں''۔ میرا خیال ہے کہ ہر پڑھنے والے نے یہی کہا ہوگا کہ اس سے بڑا جھوٹ اور دھوکہ کوئی نہیں ہے۔ نعرے بلند کرنے میں ہمارا کوئی ثانی نہیں لیکن عمل کی دنیا میں شاید ہم سے کمتر کوئی نہ ہو گا۔

معروف اصول ہے کہ کسی بھی کام کے لیئے اس کی ضرورت کے مطابق افراد کا ہونا ناگزیر ہے۔ وہ کام کھیتی باڑی ہو، کاریگری ہو یا سائنسی ترقی۔ غرضیکہ جو کام بھی ہو وہ اس کے کرنے والوں کا محتاج ہوتا ہے۔ عین اسی طرح حکومت بھی اپنے کارکنوں کی محتاج ہوتی ہے۔ اچھے کارکن ہوں گے تو حکومت بھی اچھی ہو گی اور نالائق و نااہل ہوں گے تو حکومت بھی اسی قسم کی ہو گی۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے سچے نبی رسول اللہ ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا کہ ''اگر حکومت نااہل لوگوں کے سپرد کی جائے تو پھر قیامت کا انتظار کرو''۔ اس کا مطلب صرف اور صرف یہ ہے کہ اچھی حکومت کے لیئے اہل کارندوں کا وجود لازمی ہے۔ اس سے بھی آگے ایک ناگزیر ضرورت اور ہے اور وہ ہے قیادت۔ کوئی بھی عمل ہو جب تک اُس کے تمام اجزا اپنی اپنی جگہ پر درست کام نہ کر رہے ہوں تو وہ عمل صحیح نہیں ہو گا۔ اس وقت دنیا میں جہاں بھی فساد ہے اُس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ تمام اجزا درست نہیں ہیں۔ کوئی نہ کوئی جزو اُن میں سے ٹھیک کام نہیں کر رہا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ حکومت کے اجزا کیا ہیں۔ ریاست کے اجزا میں علاقہ ہے، لوگ ہیں، سیاسی و سماجی کارکن ہیں، ملازمین ہیں اور قیادت ہے۔ خود ریاست کی تعریف بھی کم و بیش یہی ہے۔ ان اجزا کا ذکر کرنا اس لیئے بھی ضروری ہے کہ اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی فساد ہو گا یعنی وہ جزو اگر اپنے مقام سے ہٹا ہو گا تو پھر سارا نظام ہی تلپٹ ہو گا۔ اگر علاقہ کی سرحدیں آئے دن تبدیل ہوں یا ہونے کا خطرہ ہو تو اُس نسبت سے استحکام نہیں رہے گا جہاں تک لوگوں یعنی عوام کا تعلق ہے تو عوام اگر اپنے علاقے کے ساتھ محبت کی حد تک تعلق نہ رکھیں تب بھی بنیادی فساد کا موجب ہو گا۔ یہ محبت تو ایمان کا جزو ہونا چاہیئے۔ اگر عوام علاقے کے قاعدوں، قانون اور ضابطوں کا دل سے احترام نہ کریں تو یہ بدترین فساد کی شکل اختیار کرے گا جیسا ہمارے ہاں جلسے جلوسوں میں ہوتا ہے۔ پھر اسی طرح ایک جزو سیاسی و سماجی کارکن ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو عوام کی خواہشات کو کسی نظم میں ڈالتے ہیں اور اس طرح قیادت کی مدد کرتے ہیں۔ مگر یہ حضرات بھی ایجی ٹیشن کو ابھار کر اپنی آگ بجھاتے ہیں اور اس سے جو قومی نقصان ہوتا ہے وہ ناقابلِ تلافی ہے۔ عوام الناس خود بخود یہ تربیت نہیں لے سکتے۔ پھر آخری اور سب سے زیادہ مؤثر جزو قیادت یعنی لیڈر شپ یا رہنمائی ہے۔ ایک اہلیت والا کمانڈر ناکارہ و شکست خوردہ فوج کو بھی کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے جب کہ ایک نالائق لیڈر یا کمانڈر نہایت اچھی فوج کو شکست دلوا سکتا ہے۔ مگر یہ جزو ایسا ہے جس کو کوئی ادارہ یا خاص طریقہ پیدا نہیں کر سکتا بلکہ انسانی تاریخ خود اپنے کسی عمل سے لیڈر پیدا کرتی ہے جس پر کسی کا اختیار نہیں ہے۔ تاہم چونکہ کوئی معاملہ خلاء میں نہیں رہ سکتا اس لیئے انسانوں نے اجتماعی قیادت دریافت کی یعنی ادارے بنا دیئے جو اُس کمی کو پورا کر سکتے ہیں۔ جہاں بھی ان اداروں کے افراد نیک نیتی، وابستگی

اور دیانتداری سے کام کرتے ہیں اور کام لیتے ہیں وہاں اُس نظام میں فساد نہیں رہتا یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ فساد کم ہوتا ہے اور اُس کے مضر اثرات بھی کم ہوتے ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی امن اور اطمینان ہو گا وہاں یقیناً یہی چار اجزا اعتدال پر ہوں گے اور اپنا اپنا کام ٹھیک کر رہے ہوں گے۔ لہذا اس بنیادی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بھی نظام کے چلنے کا دارو مدار چلانے والے کارکنوں/افراد پر ہی ہو گا۔ افراد باصلاحیت ہوں گے تو ایک خراب گاڑی کو بھی کام میں لا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر نالائق ہوں گے تو اعلیٰ سے اعلیٰ نظام بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ نبیﷺ کا ایک ارشاد کتنا واضح ہے کہ ''حکومت نا اہل لوگوں کے ہاتھوں میں ہونا قیامت کی علامات میں سے ہے''۔ اسی طرح دوسری جگہ فرمایا ''اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ'' یعنی تمہارے اعمال درحقیقت تمہارے حکمران ہیں۔

ہمارے اسلامی نقطۂ نظر سے نہ سہی اور اگر ساری دنیا کا نقطۂ نظر کچھ اور ہو تب بھی خلافت راشدہ کو بلا شبہ دنیا کی کامیاب ترین طرزِ حکمرانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیئے دیکھنا یہ ہو گا کہ کیا وہ نظام کوئی خود کار نظام تھا یا اس کے چلانے والوں کا کمال تھا۔ کیوں کہ جب وہ حضرات گرامی نہ رہے تو اُسی نظام پر عمل نہیں ہو سکا۔ حالانکہ نظام بھی اگرچہ موجود ہے اور نہایت ہی جلیل القدر اور علم و فضیلت والے حضرات کثرت سے بعد میں بھی موجود تھے۔ اگر آج ہم کسی حادثے سے ایسے مقام پر ہوں کہ اس نظام کو لوٹایا جائے تو ایک طرف نافذ کرنے والوں کے علم، فکر ،عقیدے اور عملی و فکری صلا حیتوں کا امتحان ہوگا تو دوسری طرف جن لوگوں پر وہ نظام نافذ کرنا ہے ان کی علمی،فکری اور یقین کی بساط کا لحاظ رکھنا ضروری ہو گا۔ ہماری مجموعی حالت اس وقت ایسی ہے کہ کم از کم مجھے تو اپنے روز

مرّہ مشاہدے اور تجربے میں ایسا لگتا ہے کہ اسلامی نظام تو کجا ہم اس وقت کفر کے نظام پر بھی چلنے کے اہل نہیں ہیں۔ دکھائی یوں دیتا ہے کہ ہم کسی نظام پر چلنا ہی نہیں چاہتے اور نہ کسی نظام پر چلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ورنہ دنیا کے بیشتر حصہ پر اس وقت لادینی نظام کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

اس کی ایک مثال میاں نواز شریف کا وہ دھماکہ خیز اعلان تھا کہ اسلام کو سپریم لاء بنایا جائے۔ میں نے اپنے تجربے کی بناء پر اسی جلسہ میں کہا تھا کہ قوم اس وقت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی اور یہ اقدام نہ صرف غلط ہو گا بلکہ ناقابل عمل بھی ہو گا اور ناکامی کی برائی خواہ مخواہ اسلام کے کھاتے میں پڑ جائے گی۔ مگر چند افلاطونوں کا چسکا پورا کرنے کے نتیجہ میں جو حشر ہوا وہ بحث طلب نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کے باوجود کیا کِیا جائے اور کیا کچھ کرنا ممکن بھی ہے یا نہیں؟ اسی سے متعلق ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا حکمران حضرات (جن سے مراد صرف صدر اور وزیر اعظم نہیں ہیں بلکہ تمام عہدہ دار اور وہ لوگ جو اس وقت کار حکومت میں ملوث ہیں) چاہتے بھی ہیں یا نہیں کہ ایک مستحکم نظام قائم کیا جائے۔ عوام تو شاید چاہتے ہوں گے۔ پھر یہ کہ کیا ہم اس کے لیئے کچھ نہ کچھ قربانی بھی دے سکتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ اگر بات اس پر رک جائے کہ کچھ کرنا ہی نہیں ہے اور کچھ کیئے بغیر ہی اچھی حکمرانی ہوتی رہے گی تب تو بات آگے بڑھانے کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ تاہم جو حضرات کسی نہ کسی درجے میں ملک وملت کو اچھی حکمرانی دے کر جانا چاہتے ہیں اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیئے عزت کا مقام چھوڑنا چاہتے ہیں ان کے لیئے کم سے کم ان باتوں کا تذکرہ کر دیا جائے کہ بقول شاعر:

؎ ''شائد کہ اُتر جائے تیرے دل میں میری بات''۔

بیان کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے تجربات کی روشنی میں اچھی حکمرانی کے بعض اصول، جو اسلامی یا سیکولر (Secular) حکمرانی دونوں صورتوں میں تقریباً ایک جیسے ہیں، بیان کیئے جائیں اور پھر اس بنیاد پر مرتب ہونے والے بعض واقعات کا بھی تذکرہ کیا جائے۔ لیکن شاید زیادہ مناسب یہ ہو کہ اچھی حکمرانی کے بعض واقعات کا تذکرہ پہلے کیا جائے تا کہ وہ اصول سمجھنے میں بھی آسانی ہو۔

اگر یہ واقعات درست ہیں تو ان کی توجیح اور وضاحت بھی تو ہونی چاہیئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت میں بلقیس کا تخت لانے والا واقعہ نہایت عجیب ہے۔ اس واقعہ کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ سب امور ایمان اور اہل ایمان کی زد میں ہیں جن کے متعلق علامہ محمد اقبالؒ نے فرمایا:

؎ ولایت، پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نقطہ ایماں کی تفسیریں

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا کوئی نظام ہے جو ظاہری احکامات کے بغیر کار فرما ہوتا ہے۔ اس پر حکماء نے بہت کچھ لکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکمران کی نیت کا بھی اپنی جگہ بہت اثر مرتب ہوتا ہے محض احکامات صادر کرنے کا ہی نہیں۔ اچھے احکامات جتنے ہمارے ہاں صادر ہوتے ہیں غالبًا کسی دوسری جگہ نہیں ہوتے ہوں گے لیکن ان کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ نتیجہ بالکل برعکس ہے۔

کوئی بھی کام ہو اس میں بنیادی امر کام کرنے والے کی نیت ہے۔ تاریخ

میں بخت نصر کا واقعہ معروف ہے۔ وہ شروع سے ہی منصوبہ بناتا رہتا تھا کہ اگر مجھے حکومت مل جائے جیسا کہ اس کو حضرت دانیالؑ نے خبر دی تھی تو وہ اس طرح ظلم کرے گا اور اُس طرح کرے گا۔ چنانچہ جب اس کو حکومت مل گئی تو اس نے اسی طرح کیا اور وہ تاریخ میں ایک سفاک و ظالم حکمران کی حیثیت سے نہ صرف پہچانا جاتا ہے بلکہ سفاکی اور ظلم کی علامت ہے۔ ہمارے ہاں تو سیاستدان کوئی قومی، ملکی و ملی منصوبہ بندی کرنے یا ایسا سوچنے کی بجائے اپنے ذاتی مفادات کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ لوگوں کی نمائندگی بھی اسی مقصد کے لیئے ہوتی ہے ورنہ عوام ان کی لغت میں کوئی شے نہیں ہیں۔

نیت کی بات آئی تو ایک مسلمان حکمران کے لیئے سب سے اعلیٰ بات یہ ہوگی جو اولاً تو موجود نہیں ہے اور اگر ہے تو خال خال ہو گی کہ اس کا یقین اس بات پر ہو کہ حکومت اور عزت دینے والا وہ ایک ہی ہے، اللہ جلّ جلالہ۔ اگر یہ نیت پختہ ہو تو پھر دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت اللہ کی امانت ہے اور اس کے حکم کے مطابق ہی عمل کیا جائے۔ آج کل تو انتخابات لڑنے والا ووٹر حضرات کو ہی خدا سمجھتا ہے اور اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ حکومت دینے والے ووٹر اور اسمبلی کے ممبر ہیں۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانی کے بنیادی اصول بلا کم و کاست سب ہی وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیئے ہیں۔ مشکل البتہ یہ ہے کہ ہماری جسمانی غلامی کی طرح ابھی تک ذہنی و فکری غلامی بھی نہیں گئی۔ وہی بات جو اللہ اور رسولﷺ نے فرمائی ہو اس پر تو ہم زیادہ توجہ نہیں کرتے لیکن اگر وہی بات کسی مغربی مفکر نے کہی ہو تو ہمارے لوگ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور اسی کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مغرب میں لوگ باتوں کو عملی طور پر

کر کے دکھاتے ہیں جب کہ ہم محض جھوٹے دعووں کو ہی کافی جانتے ہیں۔ دیکھا جائے تو اس وقت مغرب میں جو بھی اچھی باتیں ہیں جن کے باعث مغرب میں استحکام ہے وہ سب وہی بنیادی امور ہیں جو اسلام کا خاصہ ہیں۔ مگر ہم لوگ ان باتوں کا جب تذکرہ کرتے ہیں تو مغرب کے حوالے سے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ہم عمل سے دور ہیں۔ جب ہم تعریف کرتے ہیں کہ بعض مغربی ممالک میں جھوٹ بولنے کا تصور ہی نہیں ہے تو ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان یاد نہیں رہتا کہ آپ ﷺ نے کیا فرمایا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں ملک میں کوئی خیانت نہیں کرتا، کوئی وعدہ خلافی نہیں کرتا، کوئی دھوکہ نہیں دیتا تو ہمیں اس بارے میں پندرہ سو سال پہلے سے اللہ اور رسول ﷺ کے ارشادات اور قرآن پر عمل کرنے والی ایک مخلوق دکھائی نہیں دیتی ۔اس لیئے جب یہ کہا جاتا ہے کہ حکمران کے لیئے اچھی حکمرانی کے اصول اللہ اور رسول ﷺ نے بتائے ہیں تو ہمارے حکمران طبقہ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان پر عمل کیسے کیا جائے گا۔

اس سے بلاتردد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگرچہ ہر عمل کا دارو مدار نیت پر ہے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا اور آئے دن ماہرینِ نفسیات بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں لیکن حکمرانوں کی نیت بطور خاص اس لیئے اہم ہے کہ اس کا اثر اس ملک کے تمام خاص و عام پر پڑتا ہے حتیٰ کہ بارش، خشک سالی، زراعت، پھلوں اور پانی پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اس لیئے اچھی حکمرانی کے لیئے ناگزیر شرط اول یہ ہے کہ حکمرانوں کی نیت اچھی ہو۔ جیسی نیت ہو گی اس ملک کے حالات بھی اسی نسبت سے ہوں گے۔ میں نے دیکھا ہے کہ حکمران کی نیت کا اثر بارشوں کے بروقت یا بے وقت ہونے پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اس میں دو امور غور طلب ہیں۔

ایک یہ کہ لیڈر یا حکمران کی سوچ کا کتنا اثر ہوتا ہے دوسرا یہ کہ حکمران کی نیت و ارادے کا حکومت پر کچھ اثر ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ تمام علمی و فکری تجربات سے یہ بات متفقہ طور پر ثابت ہے کہ حکمران کی نیت اس کے اعمال کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے اثر انداز ہوتی ہے۔ حکومتی اعمال کا اثر تو اپنی جگہ مگر محض نیت و ارادہ کا اثر بھی ہر جگہ مرتب ہوتا ہے۔ جب ہر عمل کا دارومدار نیت پر موقوف ہے تو پھر نیت کا اثر حکومتی کاموں پر بھی لامحالہ ہونا چاہیئے جیسا کہ حدیث شریف ہے ''اِنَّمَاالْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات''۔ ترجمہ: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے'' پھر یہ کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ'' ترجمہ: ''لوگ اپنے حکمرانوں (بادشاہوں) کے دین پر ہوتے ہیں'' تو اس سے بھی وہی نیتوں کے اثر والا اصول اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ کئی بڑے حکماء نے بھی یہی لکھا ہے۔ خاص طور پر شیخ سعدیؒ جو انسانی نفسیات کے بھی حکیم ہیں نے عمدہ مثالیں دے کر بات سمجھائی ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے نزدیک حکمران کی نیت کا اثر محض انسانوں پر ہی نہیں بلکہ حیوانات، فصلوں، پھلوں اور پھولوں پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اس میں میرا اپنا تجربہ بھی یہی ہے۔

نیت اور ارادہ کا اثر کس طرح ہوتا ہے اس کی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اگر حکمرانوں کی نیت میں بے یقینی ہوگی تو سارا معاشرہ بے یقینی کا شکار ہوگا۔ اگر حکمرانوں کی نیت میں انصاف نہیں ہو گا تو تمام لوگ بے انصافی پر اتر آئیں گے۔ اگر حکمران کی نیت میں درستی نہ ہو گی تو سارا معاشرہ کرپٹ ہو جائے گا۔ اگر حکمران کی نیت میں پسند و ناپسند ہو گی تو سارا معا شرہ اسی طرز کا ہو جائے گا۔ اگر حکمران جھوٹ بولیں گے تو اکثر وبیشتر لوگ جھوٹ بولنے لگیں گے۔ اگرحکمران دوسروں کے حق کو تسلیم نہیں کریں گے تو سب ہی لوگ اس طریقہ کو

اختیار کرلیں گے۔ اگرچہ یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر نہیں ہوتا بلکہ خود کار طریقہ سے خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک کر رہے ہیں جب کہ وہ غلط کر رہے ہوتے ہیں۔ غرضیکہ یہ بات بالکل درست ہے ''کہ لوگ حکمرانوں کے دین پر ہوتے ہیں''۔ جھوٹ کا ذکر آیا تو چرچل کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ کہتا تھا کہ میں ذاتی زندگی میں تو جھوٹ بول لیتا تھا مگر سیاسی زندگی میں جھوٹ نہیں بولا۔ وہ شخص تو کسی قومی ضرورت کی وجہ سے بھی جواز نکال سکتا تھا۔ دوسری طرف ہٹلر نے جھوٹ کو سچ کر کے دکھانے کا بہت زبردست اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اتنا جھوٹ بولو کہ لوگ اُسی کو سچ سمجھنے لگیں۔ موجودہ وقت میں بھی جھوٹ اور سچ میں امتیاز کرنا تقریباً ناممکن ہو رہا ہے۔ اس پر مزید ستم یہ کہ ایک عام اور غریب آدمی بھی اتنی سہولت کے ساتھ جھوٹ بولتا ہے کہ سننے والا اسی کو سچ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی بڑا آدمی جھوٹ بولے اگرچہ اس کے بھی حرام ہونے میں کوئی شک نہیں لیکن خیال ہوتا ہے کہ اس کا کوئی فائدہ ہو گا لیکن بدتر یہ ہے کہ ایک غریب آدمی جس کے ہاں جھوٹ کا کوئی تصور بھی نہیں تھا وہ بھی اتنی سہولت سے بنا سنوار کر جھوٹ بولتا ہے کہ اس پر سچ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ جو لوگ میرے پاس کسی سفارش کے لیئے یا کسی معاملے میں امداد کے لیئے آتے ہیں میں ان سے کہتا بھی رہتا ہوں کہ مجھے صحیح بات بتاؤ تاکہ اگر کوئی کمی رہتی بھی ہے تو اُس کو درست کرنے کی کوشش کریں لیکن وہ شخص قرآن کی قسم کھا کر جھوٹ بولتا ہے جس کی حقیقت چند ہی دنوں میں واضح ہو جاتی ہے۔ بعض کم بخت تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ دیکھیئے جناب فلاں شخص (شکایت کرنے والے کا مخالف) تو کہہ رہا تھا کہ ''مجاہد اول کون ہوتا ہے اس کی ایسی کی تیسی'' یہ بات صرف میرے ساتھ ہی نہیں ہوتی بلکہ جھوٹی شکایت کرنے والا تقریباً ہر شخص ہی کرتا ہے یا وہ اصل

بات کو چھپا رکھتا ہے۔ وہ شخص ظالم کے بجائے مظلومیت کا اظہار کرتا ہے اور اس طرح ہمدردی حاصل کرنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ میری طرح بعض سننے والوں کی فطری کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ شکایت کنندہ کو سچا ہی سمجھتے ہیں جس کے باعث کئی دوسری خرابیوں کا ارتکاب ہوتا رہتا ہے اور کسی نہ کسی کو نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ ان مثالوں سے بتانا یہ مقصود ہے کہ جھوٹ بولنے کے نقصانات اور خرابی کا علم تمام اہل علم کے ہاں مسلّم ہے۔ لیکن اس پر جو کچھ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے اگر اس پر یقین ہو تو مسلمان جھوٹ بولنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آج ہماری حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔

اسی طرح اگر ہم حکومت کو اللہ کی امانت سمجھیں تو پھر اس کو اسی دیانت کے ساتھ اللہ کی طرف لوٹانا چاہیئے اور کسی قسم کی فکری وعملی خیانت کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیئے لیکن اگر ہم حکمرانی کو عوام الناس کی امانت ہی سمجھیں تب بھی پوری دیانت کے ساتھ اس کو واپس لوٹانا چاہیئے۔ اگر یہ باتیں درست ہیں تو پھر ان پر عمل کرنا بھی ناممکن نہیں ہونا چاہیئے۔ البتہ شرط وہی ہے کہ نیت درست ہو کیونکہ اگر نیت پختہ ہو تو مشکل سے مشکل عمل بھی آسان ہوجاتا ہے۔ یہی فطرت کا اپنا تقاضا ہے۔ ہم روز مرہ میں یہی کچھ دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ دوسرے اچھے کاموں کی طرح اچھی حکمرانی کا آغاز بھی اگر اپنی ذات سے ہو تو دونوں اعتبار سے معاملات درست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک بڑی بات جو اس سے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ محض نیت کا خود بخود ایک اثر ہوتا ہے جو حکومت کے پورے دائرے پر مرتب ہوتا ہے۔ سب سے بڑی آسانی وہیں سے شروع ہوجاتی ہے۔ مزید یہ کہ نیت اچھی ہونے سے اللہ کی مدد و رہنمائی بھی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ دوسرا یہ کہ

جب حکمران خود کسی اچھی بات پر عمل کرے گا تو اس کا اثر بھی بہت گہرا ہوتا ہے۔ ایک عرصہ تک میں خود بھی اور بعد میں ایک عرصہ میں صدر ضیاء الحق جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ کتنے لوگوں نے بتایا کہ وہ ہمارے پیچھے بے وضو نماز پڑھتے تھے۔ لیکن ایک وقت میں شرم آئی اور پکے نمازی ہو گئے۔ ضیا ء الحق مرحوم و مغفور تو دوسرے کسی کو ترغیب نہیں دیتے تھے بلکہ میں تو ترغیب بھی دیتا رہتا تھا۔ ایک میٹنگ میں جنرل ضیاء الحق صاحب نے اسلام کے نفاذ کا ذکر کیا تو میں نے کہا کہ جنرل صاحب اسلام کا نفاذ تو آپ کر سکیں یا نہ کر سکیں ایک آسان بات جو آپ آسانی سے کر سکتے ہیں وہ یہ کہ پاکستان کی دو تہائی آبادی جوہڑوں کا پانی پیتی ہے۔ انہی جوہڑوں کا پانی جانور اور درندے بھی پیتے ہیں۔ انھیں اگر پینے کا صاف پانی میسر آ جائے تو بڑی بات ہے۔ پھر میں نے انھیں بھمبر کے جلسے کا واقعہ سنایا۔ اُس جلسے کے دوران میں نے نفاذ اسلام کی بات کی تو لوگوں نے کہا کہ سردار صاحب! آپ کو پتا ہے کہ ہم پانی کہاں سے لاتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں تو وہ کہنے لگے کہ یہ سامنے جو تالاب ہے جہاں سے جانور بھی پانی پیتے ہیں اور ہم بھی۔ ہمیں آپ صاف پانی مہیا کریں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو پانچویں خلیفہ کے نام سے مشہور ہیں، اپنے دورِ خلافت میں تمام غیر ضروری ٹیکس معاف فرما دیئے تھے حتیٰ کہ پُل جو رسل و رسائل کا اہم ذریعہ ہیں اُن پر سے بھی سامان کی نقل و حمل پر ٹیکس معاف فرما دیئے تھے۔ اور اسی طرح تمام غیر ضروری اخراجات پر بھی پابندی عائد فرما دی تھی۔ حتیٰ کہ اُن کی بیوی فاطمہ جو اُن کے پیش رو خلیفہ کی اکلوتی بیٹی تھی اور اُس کے باپ نے ہیروں اور جواہرات میں تول کر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عقد میں دیا

تھا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو حکومت کا منصب ملا تو اپنی بیوی سے فرمایا کہ پہلی مراعات کو چھوڑنا پڑے گا۔ فرمایا کہ اس حکومت کے ذریعے یا نفس کو خوش کریں جس سے جہنم ملے گی یا پھر اللہ کو خوش کریں جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائیں گے۔ تو نیک بیوی نے بخوشی اس بات کو قبول کر لیا اور اپنی ملکیت میں جو کچھ بھی تھا وہ خزانے میں جمع کروا دیا۔ پھر وقت ایسا بھی آیا کہ اُن کے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا تو بیٹیوں نے روٹی پیاز کے ساتھ کھائی جب عمر بن عبدالعزیزؒ گھر تشریف لائے تو بیٹیوں نے منہ کے اوپر چادر ڈال رکھی تھی عمر بن عبدالعزیزؒ نے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا ہوا ہے۔ بیوی نے کہا کہ اے خلیفہ گھر میں کچھ کھانے کو نہیں تھا جس کی وجہ سے روٹی پیاز کے ساتھ کھائی اور چادر اس لیئے رکھی کہ آپ کو بدبو سے نفرت ہے۔ جب گھر کے حالات اس نوبت پر آ گئے کہ گزارہ ہونا مشکل ہو گیا تو بیوی اور بیٹیوں کے اصرار پر آپؒ نے خزانہ کے خزانچی کو خط لکھا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کو دو ماہ کی تنخواہ ایڈوانس دے دی جائے تو خزانچی نے اُسی خط کی پشت پر لکھا کہ امیر المومنین لکھ کر دیں کہ وہ دو ماہ زندہ رہ کر فرائض حکومت سرانجام دیں گے؟ سبحان اللہ و بحمدہ۔ جب اُنھوں نے اس خط کو پڑھا تو فرمایا اللہ تعالیٰ آپ کا بھلا کرے کہ عمرؒ کو آپ نے جہنم کی آگ سے بچا لیا۔ پھر عمر بن عبدالعزیزؒ کا مستقلاً یہ معمول تھا کہ جب رات کو کوئی سائل آتا تو اُس سے پوچھتے کہ آپ کو عمر بن عبدالعزیز سے کام ہے یا خلیفہ سے۔ اگر وہ کہتا کہ خلیفہ سے کام ہے تو آپ فرماتے ٹھیک ہے۔ اگر وہ کہتا کہ عمر بن عبدالعزیز سے کام ہے تو وہ چراغ گل فرما دیتے اور اپنا ذاتی چراغ جلاتے اور فرماتے کہ اُس چراغ کے اندر سرکاری تیل جل رہا تھا جس کا اپنی ذات کے لیئے استعمال درست نہیں۔

ان تمام حالات کے بعد جب موت کا وقت قریب آیا تو اُس وقت اُن کے ترکے میں صرف اُس وقت کے ۱۸ درہم تھے جب کہ ۱۲، افراد کا خاندان تھا۔ تو اُن کا برادرِ نسبتی (عبدالملک) آیا اور کہا کہ اے عمر آپ نے کتنا ظلم کیا کہ اپنی اولاد کے لیئے کچھ بھی نہیں چھوڑا تو میں ایک لاکھ درہم دیتا ہوں وہ اپنی اولاد میں تقسیم کر دو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ کیا واقعی تم دینا چاہتے ہو تو عبدالملک نے کہا کہ ہاں تو عمرؒ نے فرمایا کہ مجھے اٹھاؤ اور فرمایا کہ یہ رقم جہاں جہاں سے ظلم کر کے تم نے اکٹھی کی ہے اُن ہی میں تقسیم کر آؤ۔ اور پھر اپنے بیٹوں کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا کہ جب تمہیں کسی چیز کی ضرورت پڑے تو میرے اللہ سے مانگ لینا میرا اللہ انتہائی سخی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ عبدالملک کے بیٹوں نے مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بھیک مانگی اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے بیٹوں نے ایک ایک مجلس میں سو سو گھوڑے مع سامان اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیئے۔

ان تمام تکالیف کو برداشت کرنے کے بعد جب عمر بن عبدالعزیزؒ دنیا سے تشریف لے گئے تو اللہ نے اِن کو صلہ یہ عطا فرمایا کہ اُن کا جنازہ جب قبر میں رکھا تو ایک سفید کاغذ اُن کے سینہ پر آ کر رُکا جس پر لکھا تھا ''کہ اللہ نے عمر بن عبدالعزیز کو بخش دیا''۔ لیکن جب اُن کا انتقال ہو گیا تو وہ ٹیکس نئی حکومت نے بحال کر دیئے۔ جب کچھ لوگ ایک پُل سے گزرے اور انتظامیہ نے ٹیکس کا مطالبہ کیا تو وہ فوراً سمجھ گئے کہ خلیفہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ تو بات تھی اللہ تعالیٰ کے مقبولوں کی اب ذرا دوسری طرف بھی دیکھیئے۔

ایک چرواہا دارلخلافہ سے دُور سات دن کی مسافت پر بکریاں چرایا کرتا تھا۔ اُس کی بکریوں کے ساتھ بھیڑیا بھی رہتا تھا۔ بکریاں اور بھیڑیا ایک ہی گھاٹ پر

پانی پیتے تھے۔ ایک دن اچانک بھیڑیے نے بکری کو اُچک لیا تو چرواہے نے شور مچایا کہ واللہ خلیفہ کا انتقال ہو گیا۔کسی نے پوچھا کہ تمہیں اتنی دور کیسے پتا چلا تو اُس نے کہا کہ آج بھیڑیئے نے میری بکری کو نقصان پہنچایا جب کہ اس سے قبل وہ اکھٹے ہی رہتے تھے۔ بھیڑیئے کے بکری کھانے نے یہ ظاہر کر دیا کہ خلیفہ کا انتقال ہو گیا ہے۔

اچھی حکمرانی کے لیئے دوسری اہم بات انصاف ہے۔ اس کے لیئے اول تو اپنی ذاتی غرض سے درگزر کرنا ضروری ہے ورنہ جس حکمران کی جتنی ذاتی غرض ہو گی وہ اتنا ہی انصاف سے دور ہو گا۔ انصاف صرف دماغی یا عقلی طور پر ہی نہیں بلکہ دلوں میں بھی ہونا ضروری ہے۔ اگر دلوں میں انصاف نہیں ہو گا تو محض عقل سے انصاف نہیں ہو سکے گا اور بے انصافی غیر محسوس طریقے سے بھی ہوتی رہے گی۔ وہ محض ایک مصنوعی عمل ہو گا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں جب زلزلہ آیا تو انھوں نے زمین پر اپنا دُرّہ مارا اور فرمایا''کیا عمرؓ نے زمین پر انصاف کرنا بند کردیا ہے'' زلزلہ پھر نہیں آیا ۔حضرت عمرؓ نے خلیفہ رسولﷺ ہونے کا ذکر نہیں کیا، اسلام کا تذکرہ نہیں کیا نہ ہی کسی اور خوبی کا ذکر کیا۔ صرف انصاف کا ذکر کیا۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ زلزلہ نے بھی انصاف کی بات کو سنا اور قبول کیا۔ ناسمجھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تو خلیفۂ رسولﷺ تھے چلیئے مان لیا۔لیکن عدل و انصاف کے حوالے سے برطانیہ کے وزیراعظم چرچل کا ایک قول جہاں عدل و انصاف کے ثمرات پر اُس کے کامل یقین کا عکاس ہے وہاں حکمران طبقہ کے لیئے اس میں ایک پیغام اور درس بھی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جب جرمنی نے برطانیہ کو تقریباً تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا تھا اور برطانوی حکومت کا بچنا محال

دکھائی دیتا تھا چرچل نے اپنے امراء و وزرا کو بلاکر اُن سے پوچھا کہ کیا ''ہماری عدالتیں انصاف کرتی ہیں؟'' تو انھوں نے کہا کہ ہاں ہماری عدالتیں پوری طرح انصاف کرتی ہیں۔ یہ جواب سُن کر چرچل نے نہایت اطمینان سے کہا کہ اگر ہماری عدالتیں انصاف کرتی ہیں تو دنیا کی کوئی بھی طاقت برطانیہ کو شکست نہیں دے سکتی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ انصاف کی اہمیت اور اس کے ثمرات پر اگر ایک عیسائی کو اس قدر یقین ہو سکتا ہے تو ہم تو مسلمان ہیں نام نہاد ہی سہی اور اسلام کی بنیاد ہی عدل و انصاف پر ہے۔ یہ واقعات لکھنے کا مطلب ایمان تازہ کرنا بھی ہے لیکن موجود اور آنے والے حکمرانوں کے لیئے ایک رہنمائی بھی ہے۔ ذرا آج ہم اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ کیا اس کا شائبہ بھی ہم میں موجود ہے۔

حکمران کی انصاف پسندی کے اثرات کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ جب حکمران ارادتاً انصاف پسند ہوتا ہے تو اُس کا حکم تقریباً ہر چیز مانتی ہے حتیٰ کہ ہوا، پانی، آگ اور مٹی سب۔ جب حکمران حقیقتاً اللہ کا نائب بن کر زمین پر حکومت کرتا ہے تو یہ کائنات جو چار چیزوں مٹی ، ہوا، پانی اور آگ سے بنی ہے ان کو اللہ تعالیٰ اُس شخص کے لیئے مسخر کر دیتے ہیں۔ ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی کہ دریائے نیل میں پانی خشک ہو گیا اس سے قبل ایسی صورت میں لوگ ایک کنواری لڑکی کو دلہن بنا کر اس دریا میں ڈالتے تھے تو پانی اپنی سطح پر آ جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ایک خط گورنر کے نام لکھا اور دوسرا خط دریا کے نام اور فرمایا کہ اے دریا اگر تو اللہ کے حکم سے چلتا ہے تو اللہ کا بندہ عمرؓ تجھے حکم دیتا ہے کہ چل پڑ اور اگر اپنے ارادے سے چلتا ہے تو تیرے پانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب خط دریا میں ڈالا گیا تو تاریخ گواہ ہے کہ پانی اپنی معمول کی سطح پر آ گیا اور آج

تک اپنی سطح سے نیچے نہیں اترا۔ اسی طرح ایک مرتبہ مدینہ کے ایک پہاڑ سے آگ نکلی جس کی وجہ سے خطرہ پیدا ہو گیا کہ یہ آگ مدینہ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی تو حضرت عمرؓ نے حضرت تمیم داریؓ کو حکم دیا کہ جاؤ اس آگ کو واپس پہاڑ میں بھیج دو۔ تو حضرت تمیم درائیؓ نے آگ سے فرمایا کہ میں حضورﷺ کا غلام اور حضرت عمرؓ کا قاصد تمہیں حکم دیتا ہوں کہ واپس اپنی جگہ پر چلی جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوااور پھر وہ آتش فشاں پہاڑ آج تک نہیں پھٹا اور نہ ہی آگ نکلی۔

حکمران جب انصاف پسند ہو تو اُس کا رعب اور احساس خود بخود اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ حکمرانی کے بارے میں جو آیت گزر چکی ہے اس پر غور کرنے سے یہ فلسفہ بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اللہ جس کو حکومت عطا کرتے ہیں ظاہر ہے کہ اُس کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ رات کے وقت ایک صحرا میں گشت فرما رہے تھے تو ایک جوان عورت کو رات جنگل میں سکون سے سوتے دیکھا۔ حضرت عمرؓ نے قریب جا کر اُس کو کہا تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو اور کیا پریشانی ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ کیا امیرالمومنین حضرت عمرؓ کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کیوں تو اُس عورت نے کہا کہ اگر وہ زندہ ہیں تو مجھے کوئی خطرہ نہیں اور اگر وہ مر گئے ہیں تو دوسری بات ہے۔ اُس عورت کو حضرت عمرؓ کے انصاف کا کتنا یقین تھا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ ایک مرتبہ رات کو مدینہ کی ایک گلی میں گشت فرما رہے تھے۔ ایک گھر کے اندر ماں اور بیٹی آپس میں اُلجھ رہی تھیں۔ ماں کہہ رہی تھی کہ دودھ میں پانی ملا دو اور بیٹی ماں کو منع کر رہی تھی کہ نہیں۔ کیونکہ خلیفہ نے منع کیا ہوا ہے۔ ماں نے کہا کہ اس وقت خلیفہ کہاں دیکھ رہا ہے تو بیٹی نے جواب دیا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن خلیفہ کا

رب تو دیکھ رہا ہے۔ کیسا رعب اور اعتماد اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں ڈالا ہوا تھا۔ صبح کو حضرت عمرؓ نے اُس بیٹی کا رشتہ مانگا اور اپنے بیٹے سے عقد کروا دیا۔ اور اسی خانوادہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ولادت ہوئی۔

اسی طرح ایک مرتبہ صحابہؓ کے قافلہ نے رات کو ایک جنگل میں پڑاؤ کیا تو جنگل میں موذی جانور بہت تھے۔ قافلہ کے امیر نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ اونچی جگہ کھڑے ہو کر یہ اعلان کرو کہ اے جنگل کے جانورو یہاں محمد عربیﷺ کے غلام ٹھہریں گے آپ یہاں سے نکل جاؤ۔ جب صحابیؓ نے اعلان کیا تو جنگل سے ہر قسم کے جانور اپنے بچوں کو اٹھا کر نکل گئے حتیٰ کہ سانپ اور بچھو وغیرہ بھی نکل گئے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ جنگل کا بادشاہ شیر ببر رات کو صحابہؓ کا پہرہ کرتا رہا۔ ایک روایت کے مطابق ایک صحابیؓ قافلہ سے بچھڑ گئے تو شیر اُن کے قریب آ کر دم ہلانے لگا تو صحابیؓ سمجھ گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہے اور اُس کی پیٹھ پر بیٹھ گئے تو شیر نے اُن کو اس قافلہ کے پاس پہنچا دیا۔

چنانچہ اسی طرح حضرت سعدؓ جب لشکر جرار کو لے کر جہاد کے لیئے نکلے تو راستے میں دریا حائل ہو گیا تو اُنھوں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے تو مشورہ میں طے پایا کہ ہم قوم موسیٰؑ نہیں ہیں ہم محمد عربیﷺ کے غلام ہیں اگر آپ ہمیں حکم دیں گے کہ آگ کے سمندر میں کود جاؤ تو ہم کود پڑیں گے تو حضرت سعدؓ نے سب سے پہلے اپنی سواری کو دریا میں ڈالا اور ساتھ ہی دوسرے صحابہؓ نے بھی اپنی سواریوں کو دریا میں ڈال دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُس پانی کے اوپر سے اس طرح گزار دیا کہ اُن کی سواریوں کے سُم بھی پانی سے تر نہیں ہوئے۔ اسی بات پر علامہ محمد اقبالؒ نے کہا تھا:

؎ دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

یہ بات صرف اُس وقت تک ہی محدود نہیں تھی۔ ہم گناہ گار لوگوں نے بھی اس کا وافر مظاہرہ دیکھا جس کا ذکر میں نے نیلہ بٹ کی تقریبات میں کئی بار دہرایا ہے کہ کس طرح سال ۱۹۴۷ء۔۴۸ میں جہاد کے دوران دریائے جہلم میں رات کے وقت گرا ہوا ایمونیشن برآمد ہوا تھا۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ جب بندہ یقین کے ساتھ اللہ پر بھروسہ اور اعتماد کر لیتا ہے تو پھر اسی طرح قدرت کاملہ اس کی رہنمائی اور امداد کرتی ہے۔ ملکی کائنات کا سارا نظام اُس کا سازگار بن جاتا ہے۔

حکمران کی نیت کا اثر بہرصورت رعایا کی جان و مال پر پڑتا ہے۔ شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ:

''ایک دن ایک بادشاہ ایک باغ میں گیا اور باغبان سے کہا کہ انار کا رس پلاؤ۔ اُس نے ایک ہی انار سے پورا گلاس نچوڑا اور بادشاہ کو پیش کیا۔ بادشاہ نے سوچا کہ اتنا قیمتی باغ ہے اس پر کیوں نہ ٹیکس لگایا جائے اور ساتھ ہی کہا کہ ایک اور گلاس پلاؤ۔ تو باغبان کافی دیر بعد رس کا گلاس لایا۔ بادشاہ نے تاخیر کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی نیت خراب ہوگئی ہے۔ اُس کے بعد بادشاہ شکار کو چلا گیا اور راستے میں اپنی ٹیکس والی نیت کو بدل دیا۔ واپسی پر بادشاہ نے انار کا

رس مانگا تو باغبان پہلے کی طرح جلد ہی گلاس بھر لایا۔ بادشاہ نے پھر وہی سوال کیا کہ اس بار اتنی جلدی کیسے لائے ہو۔ باغبان نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی نیت درست ہو گئی ہے''۔

یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اچھی نیت سے کیا مراد ہے۔ کسی چیز کو جب ہم اچھا کہتے ہیں تو مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ خالص ہے اور اس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہے ۔اب حکمرانی میں خالص نیت کیا ہے اور ملاوٹ کیا ہے۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تمام تر واقعات اور تجربات بتاتے ہیں کہ حکمران کی نیت عوام کی فلاح وبہبود کی ہونی چاہئیے اس میں اگر اس کی اپنی ذات کا مفاداتی عنصر شامل ہو گا تو وہ نیت خالص نہیں رہے گی اور جب نیت خالص نہیں رہے گی تو پھر وہ مسلسل خراب ہوتی چلی جائے گی۔ اور اس کا اثر بھی اسی نسبت سے ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفۂ اول سے لے کر آخر تک تمام خلفاء کی ذاتی زندگیوں میں حکومت کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ اگر حاکم حضرات صرف اسی ایک وصف کو اپنا لیں تو اس کی برکت سے حکومت کا تمام کاروبار بابرکت ہو جائے گا اور پھر حاکم کو انصاف کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ اس بات کے لیئے یقین والے حضرات کی ضرورت ہو گی۔ حکمران کی بے یقینی ایسی خرابی ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی چیز میں استحکام ممکن نہیں اور افراتفری میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ علامہ اقبالؒ کے مطابق بے یقینی سے تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں اور تحقیق وجستجو بے مزہ ہو جاتی ہے۔ اُن کے بقول:

؎ بے یقیں را قوّت تخلیق نیست
بے یقیں را لذّت تحقیق نیست

یقین کے ساتھ اچھا عمل تو بہر حال اثر انداز ہوتا ہے بلکہ برا عمل بھی اگر یقین سے کیا جائے تو اس کا اثر بھی گہرا ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ زیادہ لوگ یقین کی دولت سے محروم ہوتے ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور اس مشہور ڈاکو کا درج ذیل واقعہ کتنا حیرت انگیز ہے اور اس اصول کی کتنی واضح نشاندہی کرتا ہے:

''عباسیہ دور حکومت میں فتنۂ خلق قرآن یعنی یہ کہ قرآن کریم مخلوق ہے قدیم نہیں ہے اپنے عروج پر تھا۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے انتہائی پامردی سے اس کا مقابلہ کیا، دارورسن بھی سہے، پابہ زنجیر بھی کیئے گئے، لیکن اپنے موّقف میں ذرا بھی لچک نہ دکھائی۔ اسی دوران حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی ملاقات ابو الہیثم نامی ایک مشہورِ زمانہ ڈاکو سے ہوئی جو مختلف جرائم میں ملوث تھا اور حکومت کی سزائیں کاٹ چکا تھا۔ اُس نے امام احمد بن حنبلؒ کو کہا کہ ''آپ اپنے موقف سے ہرگز منحرف نہ ہونا۔ مجھے حکومت کے کارندے اذیتیں دیتے ہیں لیکن میں اپنے موقف سے بالکل تبدیل نہیں ہوا باوجود اس کے کہ میں جانتا ہوں کہ میں غلط کام کر رہا ہوں۔ جب کہ آپ تو حق پر ہیں۔ قائم رہیں''۔ امام صاحب نے فرمایا کہ سفر عزیمت میں اُس ڈاکو کی بات نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔

یقین ہو تو ننانوے فیصد مشکلات خود بخود راستہ چھوڑ دیتی ہیں۔ یقین کے

سامنے وہ مشکلات جن سے انسان ڈرتا ہے، ان کی سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی۔ بقول اقبالؒ:

؎ جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اور

؎ جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی

خودی سے بھی مراد یقین ہے۔ تو گو یا ایک اچھی حکومت کے لیئے اخلاص نیت کے ساتھ یقین کا پختہ ہونا اور اپنی ذات سے اس کو شروع کرنا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو اچھی حکمرانی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو گا۔

یہ طے کر لینے کے بعد کہ حکمران کی نیت کا اخلاص اور انصاف اچھی حکمرانی کے بنیادی اوصاف ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ بے انصافی کی جڑ اور بنیاد کیا ہے۔ بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ بنیاد کار حکومت میں حکمران کی ذاتی پسند و ناپسند ہے۔ جب تک اس کا حل نہیں ہوتا تب تک اگر کوئی دعویٰ کرتا بھی ہے کہ وہ انصاف کرتا ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اگر ذاتی پسند و نا پسند کا ایک شائبہ بھی ہو گا تو انصاف نہیں ہو سکتا اور جہاں انصاف نہیں ہو گا وہاں فساد اس کی جگہ لے لے گا۔ جب تک ذاتی پسند و ناپسند دل سے بھی نہ نکل جائے اس وقت تک انصاف نہیں ہو سکتا۔ آج کل ہمارا پورا معاشرہ اسی ذاتی پسند و ناپسند کا نہ صرف شکار ہے بلکہ شاہکار بھی ہے۔ اسی لیئے ہر طرف بے چینی کا ایک عجیب عالم ہے جن کے پاس ہے وہ بھی پریشان اور جن کے پاس نہیں وہ بھی سرگرداں ہیں۔ کوئی فرد ایسا نہیں(الّا ماشااللہ) جو اللہ کو گواہ بنا کر اپنے آپ سے یہ کہہ سکے کہ میں انصاف کر سکتا ہوں یا یہ کہ میرے دل میں انصاف موجود بھی ہے۔ جب کوئی

معاشرہ مجموعی طور پر بے انصاف ہو جائے اور ذاتی پسند و نا پسند کو ہی انصاف سمجھنے لگے تو پھر عذاب الٰہی کو دور نہیں سمجھنا چاہیئے خواہ اس کی شکل جو بھی ہو۔ اللہ معاف کرے آج ہمارا پارلیمانی جمہوری نظام اسی ذاتی پسند و ناپسند کا مظہر ہے۔ نظام کا قصور ہر گز نہیں ہے بلکہ اس کا دارومدار اُن افراد پر ہے جو کرسیوں پر براجمان ہیں۔ یہ میرا ووٹر ہے، یہ میرا عزیز ہے، یہ میری پارٹی کا آدمی ہے، اس لیئے دوسرے لوگوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ لعنت اتنی گہری ہوتی جارہی ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں ہے۔ حکومت صرف نمائندوں اور عہدہ داروں کی ذات کے لیئے مختص ہے۔ یہ ہے وہ تصور جو آج کل رائج ہے۔ جو شخص جتنے بڑے مرتبے و منصب پر فائز ہے وہ اتنا ہی اسی ذاتی پسند و ناپسند میں پھنسا ہوا ہے۔ دیکھنے سننے میں تو لوگ نہایت معتبر دکھائی دیتے ہیں لیکن اگر ان کے اندر جھانک کر دیکھیں تو آدمی حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات یہ تمیز کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں کوئی انسان بھی ہے یا نہیں۔ اچھی حکومت یا اچھی حکمرانی (Good Governance) کے لیئے کوئی ایسا اصول، نسخہ یا طریقہ متعین کرنا ممکن نہیں ہے نہ اس کا کوئی فائدہ ہے جو عام انسان کی سمجھ میں ہی نہ آئے۔ اچھی حکمرانی کے لیئے بہر حال حکومت کے سربراہ کا اچھا ہونا شرط اول ہے۔ سوال یہ ہوسکتا ہے کہ ہر حکومت کا سربراہ اپنے آپ کو اچھا ہی سمجھتا ہے۔ پھر اس پر زائد یہ کہ اس کے ارد گرد کے لوگ بھی اس کو یہی بات باور کراتے رہتے ہیں کہ آپ جیسا کوئی دوسرا پیدا ہی نہیں ہوا۔ ایک اور طبقہ ایسے لوگوں کا ہے جو دیکھتے ہیں کہ حکمران کس بات کو پسند کرتا ہے تو وہی بات کرتے ہیں اور حکمران کو شیشے میں اتار کر اس کی اس طرح مت مار دیتے ہیں کہ وہ خود کو واقعی لا ثانی سمجھنے لگتا ہے۔ ایک معروف سیاسی کارکن ہمارے ایک صدر صاحب کے بہت قریب تھے۔ کچھ معاملات خراب ہو رہے

تھے تو میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ کیا فلاں خرابی نہیں ہے۔ انھوں نے تائید کی کہ واقعی یہ خرابی موجود ہے۔ میں نے پوچھا کہ پھر آپ کی دوستی کا کیا فائدہ ہے آپ صدر کو اس سے کیوں آگاہ نہیں کرتے جب کہ آپ ان کے اتنے قریب ہیں اور ہمدردی کا تقاضا بھی تو یہی ہے۔ تو وہ کہنے لگے ''آپ کا کہنا ٹھیک ہے۔ لیکن میں اگر ان کو صحیح بات بتاؤں گا تو وہ مجھ سے خفا ہوں گے'' حکمرانوں کے سامنے سچی بات کہنا ہر زمانے میں مشکلات کا باعث رہا ہے جیسا کہ حدیث شریف ہے۔ اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَآئِرٍo ترجمہ: ''سب سے افضل جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے''۔ میں نے یہ بات اکثر سنی ہے کہ ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم صدر، وزیراعظم کو خواہ مخواہ ناراض کریں۔ حکمران یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب اس کے دوست ہیں۔ جب مشکل آن پڑے تو اس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے مگر وہ لا علاج ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بعض ایسے حکمران بھی گزرے ہیں جو ہاروں کا انبار دیکھ کر بتاتے تھے کہ اتنے ہزار لوگ ان کے ساتھ ہیں جب کہ بعد میں ان میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں رہا۔ آج کل تو حکمران ظالم نہ ہو تب بھی لوگ اتنے کمزور ہیں کہ ہمدرد حکمران کے سامنے بھی سچی بات کرنے سے کتراتے ہیں کہ شاید ناراضگی نہ ہو جائے۔ اور حکمران بھی اس سے خوش ہوتے ہیں کہ ہر بات میں ان کی تائید کی جاتی۔ عام کارکن تو ایک طرف، یہ بات خواص پر بھی صادق آتی ہے لیکن ان کی مجبوریاں دیکھیئے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں حکمران کے مشیر اچھے نہیں تھے۔ وہ بات بھی اگرچہ کافی حد تک درست ہے لیکن جب حکمران خود ایسے ہی خوشامدیوں کو پسند کرے تو کیا کیا جائے۔ وہ حکمران خوش نصیب ہے جس کو جرأتمند اور درست بات کہنے والے مشیر میسّر آ جائیں۔ اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اگر اپنی صفوں میں دستیاب نہ ہوں تو حکمران ہمت کر

کے اپنے مخالفین کی صفوں میں ایسے لوگ تلاش کرے ورنہ اچھے مشیر اور کہاں سے آ سکتے ہیں۔ ایک صاحب جو ایک حکمران کے عزیز تھے میں نے ان سے پوچھا کہ اس حکمران کے گرد جو لوگ ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ غصہ سے کہنے لگے کہ سردار صاحب میرا بس چلے تو (پنجابی میں گالی دے کر کہا) میں ان ایسوں تیسوں کو گولی مار دوں۔ آپ رائے پوچھ رہے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ ایسے حکمرانوں کو بھی یہ علم ہوتا ہے اور ان کے بعض ہمدرد لوگ بتانے کی جسارت بھی کرتے ہیں کہ یہ لوگ ان کے ہمدرد نہیں ہیں لیکن وہ حکمران بجائے غور کرنے کے خود یہ بات کہنے والے سے ہی ناراض ہو جاتے ہیں۔ یہ باتیں کوئی آج کل سے متعلق نہیں ہیں بلکہ تاریخی کتابوں میں اور افسانوں میں خدا جانے کب سے چلی آ رہی ہیں مگر کسی نے سبق نہیں سیکھا۔ ہر حکمران کم یا زیادہ اس مصیبت میں گرفتار رہتا ہے۔ البتہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ میرے براہ راست مشاہدے اور تجربے سے متعلق ہے، سنی سنائی داستان نہیں ہے۔

اچھی حکمرانی کے لیئے جہاں بہت سے اصول، قاعدے اور ضابطے بیان کیئے گئے ہیں، کیئے جاسکتے ہیں اور کیئے جاتے رہیں گے وہاں بنیادی امر یہ ہے کہ کیا کوئی اصول وقاعدہ ایسا ہے جو محض اپنی قوت سے انسانوں کی ایسی اصلاح کر دے کہ لوگ خود بخود اس پر عمل کرنے لگیں۔ ظاہر ہے ایسا ممکن نہیں ہے۔ انسان طبعاً پابندی کے خلاف ہے خاص طور پر جن کی فطرت میں شرارت ہو۔ اسی طرح آخر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اچھی حکمرانی کا دارومدار بہت حد تک اچھے کارکنوں پر بھی ہے۔ مولانا مودودیؒ مرحوم ومغفور نے اپنے کام کا آغاز اسی فکر سے کیا تھا۔ وہ رجال کار یعنی باصلاحیت کارکن پیدا کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ بات محتاج بیان نہیں

ہے کہ یہ کوشش ان کی ذات تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا میں بڑے انسان اداروں نے پیدا نہیں کیئے بلکہ بڑے انسان تاریخ خود پیدا کرتی ہے۔ حضورﷺ کے سیاست دان صحابہؓ میں حکمران صرف اور صرف وہی تھے جو اسلام سے پہلے بھی سیاست میں معروف و معزز تھے۔ یوں تو ہر کارکن اپنے خیال میں قائد اعظمؒ اور مولانا مودودیؒ ہے لیکن یہ تو

؎ ''دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے''

کے مصداق اور کچھ نہیں ہے۔ تاہم یہ کوئی ناممکن بات بھی تو نہیں ہے۔ ہمارے اردگرد جگہ جگہ اچھی حکمرانی کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت وہ سب غیر مسلموں کے ہاں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم اس پر سیاسی کارکنوں اور دانشمند و دانشور لوگوں کو غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر معالجہ میں کیا کمی ہے۔ بیماریوں کے علاج کے لیئے امریکہ، برطانیہ اور جرمنی وغیرہ پر تو ہمیں اعتماد ہے لیکن وہیں سے تربیت وتعلیم حاصل کر کے وطن واپس آنے والوں پر اس کا اثر کیوں نہیں ہے۔شکل میں، عقل میں اور علم میں تو کوئی کمی نہیں ہے پھر کمی کس چیز کی ہے۔ وہ چیز غالباً وابستگی ہے جسے Commitment کہتے ہیں اور جو گم ہے۔ وہ کہاں سے لائیں۔ کیا کہیں سے خریدی جا سکتی ہے۔ اس وابستگی میں روز بروز تیزی کے ساتھ کمی ہو رہی ہے۔ ہمارے دعوے تو بہت بلند ہیں لیکن اندر کھوکھلا ہو رہا ہے۔

میں نے ایک موقع پر بھٹو صاحب سے کہا تھا کہ اگر میرے خلاف کوئی شکایت ہو تو مہربانی کرکے مجھے ضرور بتایئے گا۔ غصہ سے کہنے لگے کیا ''آپ کے خیال میں میں (فلاں) آدمی ہوں کہ میرے کان میں کوئی کھس کھس کرے گا تو میں اُس

کی بات مان لوں گا''۔ پھر نہ صرف وہی ہوا بلکہ حد یہ ہے کہ ان ہی کھس کھس کرنے والوں نے بھٹو صاحب سے عہد لیا کہ وہ میرے ساتھ ملاقات نہیں کریں گے۔ کیونکہ جب کبھی ملاقات ہو جاتی تو جو کچھ تانا بانا ان لوگوں نے ملی بھگت سے بُنا ہوتا سب خراب ہو جاتا۔ لیکن پھر بھی وہی لوگ غالب آگئے اور ملاقات نہ ہونے دی۔ یہاں تک کہ، جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، بھٹو صاحب بار بار میرا پوچھتے رہے مگر ان سے کہا جاتا رہا کہ سردار قیوم آپ سے ملنا ہی نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے ان کو کتنا غصہ آتا رہا ہو گا۔ مگر جب اصل بات پتا لگی جو اگرچہ بعداز وقت پتا لگی تو بہت افسوس کرتے تھے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ بھٹو جیسی طاقتور اور ذہین شخصیت بھی خوشامدی کارکنوں کے نرغے سے نہ بچ سکی تو اور کون مائی کا لعل ہے جو بچ سکتا ہے۔ پھر خاص کر جب کہ حکمران خود بھی خوشامد پسند ہو اور سامنے بیٹھ کر اپنی تعریف سننے کی جہالت کا عادی ہوجائے تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔

غالباً خلیفہ دوئم حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ اچھا حکمران وہ ہے جس کو مرنے کے بعد لوگ اچھے نام سے یاد کریں۔ یہ بھی گویا کوزے میں دریا کو بند کرنے کے مترادف ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکمران کی موت کا انتظار کرنا ہو گا۔ بلکہ یہ کہ حکمران اپنی زندگی میں ایسا کام کر جائے جو اُس کی موت کے بعد بھی یاد کے قابل ہو۔ تاریخی عمل سے پتا چلتا ہے کہ اچھے حکمران بھی اس دنیا میں کچھ کم نہیں ہوئے ہیں۔ تاہم یکجا کر کے اگر دیکھا جائے تو اچھی حکمرانی نیت سے شروع ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا اچھی نیت کے ساتھ ساتھ مسلمان کے لیئے اچھی حکمرانی کی بنیاد اللہ کی ذات پر یقین بھی ہے۔ وہ جتنا قوی ہوگا اتنا ہی وہ شخص کار حکمرانی میں قابل ہوگا اور معاملات کو درست کر سکے گا بلکہ اس کی غیبی

امداد بھی کھلم کھلا ہوتی رہے گی۔ نیز اگر وہ حکومت کو اللہ کی امانت اور عوام کی امانت سمجھے گا تو پھر وہ اپنے معاملات کو بھی اسی حساب سے نمٹائے گا۔ اللہ پاک پر یقین کا معاملہ اپنی جگہ ہے مگر پختہ یقین کسی چیز پر بھی ہو بلکہ بے یقینی کے مقابلے میں تو کسی غلط بات پر یقین کرنا بھی بہتر ہے۔

انگریز اگرچہ مسلمان نہیں تھا مگر اچھی انتظامیہ دے گیا تھا اور لوگ آج تک اُسے یاد کرتے ہیں۔ پی این اے کی ایک میٹنگ میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے ضمن میں ایک بار میں نے صدر ضیاء الحق مرحوم کو کہا تھا ''اگر آپ اس ملک کو اچھی دیانتدار اور باصلاحیت انتظامیہ مہیا کر دیں تو لوگ آپ کو کئی پشتوں تک یاد رکھیں گے۔ باقی کام آپ (میں نے مفتی صاحب اور دوسرے اکابر کی طرف اشارہ کر کے کہا) ''ان لوگوں کے لیئے چھوڑ دیں''۔ کچھ ناراضگی سے کہنے لگے جرائم کیسے بند ہونگے؟ میں نے پوچھا آپ جرائم بند کرنا چاہتے ہیں یا لوگوں کے ہاتھ کاٹنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے جرائم بند کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ میں کچھ دیر جیل میں رہا ہوں اس لیئے مجھے معلوم ہے کہ جو پیشہ ور عادی مجرم ہیں وہ رات کو جیل خانوں سے نکال دیئے جاتے ہیں۔ جرم کر کے صبح سے پہلے جیل میں واپس آجاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بتایئے صدر صاحب آپ ان کا کیا کریں گے۔ کہنے لگے پھر کیا کیا جائے۔ میں نے اپنی صدارت کے دور کا ایک واقعہ سنایا کہ میرپور میں اچانک اطلاعات ملیں کہ چوریاں شروع ہوگئی ہیں جس طرح آج کل جرائم ہو رہے ہیں۔ میں نے ایس پی کو فون کیا تو اس نے اقرار کیا کہ واقعی ایسا ہی ہے۔ ساتھ ہی یہ کہا کہ باہر سے کچھ لوگ آ گئے ہیں۔ میں نے کہا کیا کل صبح تک یہ چوریاں بند ہوں گی یا نہیں۔ کچھ دلیل دینے لگا تو میں نے کہا کہ دلیل مت دیں۔

ہاں یا نہ میں بتائیں کہ کل صبح تک چوریاں بند ہوں گی یا نہیں۔ کہنے لگا ایک دو گاڑیاں گشت کے لیئے مل جائیں تو یہ بند ہو جائیں گی۔ دو گاڑیاں جو شاید بہانہ ہی تھا میں نے مہیا کر دیں پھر جب تک میں صدر رہا کوئی چوری نہیں ہوئی۔ میں نے صدر صاحب موصوف کو بتایا کہ جرائم پنجاب میں نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں مگر کسی اِکا دُکا واقعے کے علاوہ باقی تمام واقعات ایک منصوبہ بندی سے کیئے جاتے ہیں جس میں سرکار پوری طرح شامل ہوتی ہے اس لیئے میں نے کہا اگر آپ واقعی جرائم بند کرنا چاہتے ہیں تو پولیس کے سربراہان کو بلاکر پوری سنجیدگی سے حکم دیجیئے کہ جرائم بند ہوں ورنہ ان کو سزا دی جائے گی۔ تو یقیناً جرائم رک جائیں گے۔ مگر یہ بات تب ہوسکتی ہے کہ خود حکمران کے دل میں جرم کا عنصر نہ ہو اور دوسرا یہ کہ اس کی معلومات درست ہوں اور وہ محکم یقین کے ساتھ حکم دے۔ سیّدنا عمرؓ راتوں میں جو گشت کرتے تھے تو وہ بھی حالات سے با خبر ہونے کا ہی ایک ذریعہ اور طریقہ تھا۔ آجکل کے نظام میں اطلاعات کے غلط ہونے کا تو یقین ہو سکتا ہے مگر اطلاعات درست ہونے کا یقین نہیں ہے اور یہ پوری دنیا میں اسی طرح ہے۔ جب تک کسی حکمران کی رسائی عوام تک نہیں ہو گی اطلاعات ہمیشہ مصنوعی ہوں گی حقیقی نہیں ہوں گی۔ مجھے اس کا اتنا وافر تجربہ ہے کہ اس پر ایک علیحدہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ میں نے کسی اور کتاب میں قدرے تفصیل سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

تیسری بات اگر کوئی حکمران کر سکے تو وہ اپنے آپ کو عوام الناس میں سے ایک سمجھے۔ یعنی لوگ اگر حکمران کو دیکھیں یا ملیں تو اُنھیں احساس کمتری نہ ہو اور وہ اس حکمران کو غیر مخلوق نہ سمجھیں بلکہ اپنے جیسا ہی ایک شخص سمجھیں۔ اس کے لیئے ضروری ہے کہ حکمران کے رہن سہن، لباس، بودوباش، بول چال میں کوئی غیر

معمولی تبدیلی نہ ہونے پائے۔ یہ باتیں نئی نہیں ہیں بلکہ قرن اوّل میں دیر تک ان پر عمل ہوتا رہا۔ امیر المؤمنین خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ نے ایک گورنر کو اس شکایت پر معزول فرمادیا تھا کہ وہ باریک لباس پہننے لگ گئے تھے جو عوامی لباس سے بہتر اور مختلف تھا۔ عین ممکن ہے کہ اب بھی ایسے لوگ دنیا میں موجود ہوں جو اپنے لباس اور وضع قطع میں کسی مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود درمیانے طبقے کا لباس پہنیں۔ موجودہ دور کے مسلمانوں کو تو یہ بات شاید نصیب نہیں ہے البتہ غیر مسلموں میں ہر دور میں اس کے وافر نشانات ملتے ہیں جب کہ یہ تمام روایات مسلمان حکمرانوں سے ہی نقل کی گئی ہیں۔ جیسے امیر المومنین حضرت عمرؓ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو بیت المقدس کے کنجی بردار راہب نے کہا کہ میں جب تک فاتح کو نہ دیکھوں گا اس وقت تک بیت المقدس کی چابی اُن کے حوالے نہیں کروں گا۔ کیوں کہ تورات میں لکھا ہوا ہے کہ جو آدمی بیت المقدس فتح کرے گا اس کے لباس پر گیارہ پیوند ہوں گے۔ جب لباس دیکھا گیا تو حضرت عمرؓ کے کپڑوں پر گیارہ پیوند تھے۔ ہمارے ہمسایہ ملک کے عظیم رہنما مہاتما گاندھی بہت معمولی لباس پہنتے تھے۔ ان کی تقلید میں ہزاروں لوگ ایسا کرتے تھے اور اب بھی کر رہے ہیں مگر ان کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس دور میں بھی ہمارے پڑوسی ملک میں یہی رسم و رواج ہے۔ اسی طرح کتنے ہی ایسے حضرات ہر دور میں موجود رہے ہیں جو اپنی وضع قطع اور لباس میں عام آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ خواہ کسی بڑے مرتبے پر ہی کیوں نہ فائز ہوں۔ ان کے ہاں بڑائی کا معیار اعلیٰ درجہ کا غیر ملکی سوٹ نہیں بلکہ اندر کا انسان ہے۔

اسی ضمن میں بے جا نہ ہو گا اگر انگریز کے دور کی ایک مثال بھی بیان کر دی

جائے۔ جون جولائی کے گرم ترین موسم میں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر جہلم کے دورے پر چلا گیا۔ وہ دور گھوڑوں کے استعمال کا تھا۔ اتفاق سے رمضان المبارک بھی تھا۔ وہ انگریز ڈپٹی کمشنر دن بھر دورے پر رہا اور رمضان کے احترام میں کچھ کھایا پیا نہیں۔ یہاں تک کہ وہ شام کے قریب گھوڑے سے گرا اور مر گیا۔ اس واقعہ کو لوگ کیوں نہ یاد کریں گے۔ چنانچہ انگریز حکمرانوں کے ایک ادنیٰ سے اعلیٰ رکن نے اسی وابستگی (Commitment) سے اپنا فرض ادا کیا۔ حکمرانی کے اصولوں پر دیانت سے عمل کیا اور کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اگر ہمارے لوگ اس سے سبق سیکھنے کی کوشش کریں اور اس سے ہزار گنا کم وابستگی کا عملی اظہار کریں تو کیا حرج ہے۔

چوتھی بات یہ جو کہا گیا ہے کہ لوگ حکمرانوں کے طریقے پر ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حکمران جھوٹ بولے گا تو اکثر لوگ خود بخود جھوٹ کو اپنا لیں گے۔ اسی طرح اگر سچ بولے گا تب بھی لوگوں پر اثر ہو گا۔ آج غور کریں کہ ایسے غیر مسلم ممالک کی کمی نہیں ہے جہاں جھوٹ بولنا اتنا بڑا جرم ہے کہ کوئی یقین نہیں کرتا کہ کوئی شخص جھوٹ بول سکتا ہے۔ البتہ اگر ایسا ہو جائے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ مسلمان ہو گا کتنے افسوس کی بات ہے۔ کیا تاریخ میں ایک طویل عرصہ ایسا نہیں گزرا کہ اگر کوئی سچ بولتا تو لوگ کہتے کہ یہ مسلمان ہو گا جب کہ آج اس کے بالکل برعکس ہے۔ چلیئے اللہ اور رسولﷺ کے حکم ماننے کے اگر ہم اہل نہیں ہیں تو غیر مسلم جن اصولوں پر عمل کرتے ہیں (اور وہ اصول بھی اگرچہ وہی ہیں جو اللہ اور رسولﷺ نے بتلائے ہیں) تو وہی سمجھ کر ہی عمل کرتے رہیں۔ آخرت نہ سہی کم از کم دنیا تو عزت سے گزر جائے۔

پانچویں بات جو حکمران، انتظامیہ اور حکمران جماعت کے افراد سب کے لیئے

ناقابل بیان حد تک مفید ہے یہ ہے کہ حلال حرام کی تمیز کریں جو آج کل ویسے بھی مفقود ہے۔ کسی کو اگر توفیق ہو اور وہ کر کے دیکھے تو فرق پتا چلے گا۔ حلال و حرام محض قصہ کہانی نہیں ہے بلکہ سائنسدانوں نے عادات کی ایک پوری کیمسٹری بھی دریافت کرلی ہے۔ البتہ شاید یہ بات ابھی معلوم نہیں ہے کہ عادات پر کیا کیا چیزیں ہیں جو اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی نہ کسی حد تک تو یہ بات مزید کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے کہ انسانی عادات پر کھانے پینے کا کتنا گہرا اثر پڑتا ہے۔ حرام کھانا محض گناہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ انسان کے خون میں شامل ہوکر گوشت پوست بن جاتا ہے اور عادات کا سبب بنتا ہے۔ پھر وہ قبر سے لے کر حشر تک ساتھ دیتا ہے۔ یاد آیا کہ یہ جو ہم عذاب قبر اور دوزخ کا ذکر کرتے ہیں خواہ یقین ہو یا نہ ہو لیکن وہ وقت دور نہیں ہے جب ایک انسان کی کیمسٹری کا تجزیہ کر کے یہ پتا لگایا جا سکے گا کہ یہ انسان دوزخی ہے یا جنتی۔ اگرچہ اس وقت یہ بات کچھ عجیب سی لگے گی لیکن اگر دوزخ اور جنت کی حقیقت ہے جو یقیناً ہے تو پھر وہ کئی دوسرے امور کی طرح سائنسی طریقہ سے بھی ثابت ہو جانی چاہیئے۔ اس لیئے بھی کہ جنت و دوزخ دراصل ہے ہی انسان کے اپنے اندر۔ مجھے حق الیقین علم ہے کہ ایسا وقت آئے گا کہ جب انسان کے مرنے کے بعد اس کی ہڈیوں کا بلکہ قبر کی مٹی کا بھی تجزیہ کر کے بتلایا جا سکے گا کہ یہ شخص دوزخی ہے یا جنتی اور یہ بھی کہ یہ کتنا عرصہ دوزخ میں رہے گا۔ اس لیئے کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے اور حقیقت محض وہم و گمان نہیں ہے۔ مردہ انسان کے باقی اجزا وغیرہ کے اندر بھی دوزخ کی آگ کی مقدار موجود ہونی چاہیئے۔ البتہ اس آگ کی شدّت یا حدّت کو ماپنے کا کوئی آلہ ابھی شاید ایجاد نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے بھی ایک مسلمان حکمران کو یقین ہونا چاہیئے کہ دوزخ وجنت ایک حقیقت ہے ۔ نیز حلال حرام میں عملاً تمیز

کرنے سے بھی پتا چلے گا کہ کیا یہ حقیقت ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے عقیدے میں برکت بھی ایک چیز ہے جو اللہ کی مہربانی سے حاصل ہوتی ہے۔ میرا اپنا ہی نہیں بلکہ لاکھوں لوگوں کا تجربہ ہے کہ برکت ہوتی ہے تو کسی چیز کی ادنیٰ مقدار بھی کفایت کر جاتی ہے۔ اور جب بے برکتی ہوتی ہے تو وافر مقدار بھی ضرورت کو پورا نہیں کر پاتی۔ میرے علاوہ نہ جانے کتنے لوگوں کو اس تجربے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ جب میں کھانے پینے کا ذکر کرتا ہوں تو ظاہر ہے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں کئی چھوٹے چھوٹے حکمران ایسے گزرے ہیں جو خشک روٹیاں کھاتے تھے۔ ظا ہر ہے کہ ان کا یہ عمل غربت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ وہ تو حکمران تھے البتہ یہ ذاتی زندگی کو درست رکھنے کی نیت سے تھا۔ یہی حال انبیاء وصلحا کا رہا ہے۔ ان کے نزدیک حکومت میں ہونے نہ ہونے کا کوئی فرق نہیں تھا سوائے ذمہ داری کے۔ اگر ان حضرات کے واقعات لکھنا شروع کریں تو ان کی کوئی حد ہے نہ حساب۔ حکمران اگر خود کو اللہ کے سامنے جوابدہ سمجھے تو یہ 'نور علیٰ نور' ہے۔ پھر مزید کچھ سمجھنے سمجھانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر وہ نہیں تو اپنے آپ کو عوام کے سامنے ہی جوابدہ سمجھے تب بھی اعلیٰ درجے کی حکمرانی کے تقاضے پورے ہوجاتے ہیں کیونکہ عوام الناس بھی اللہ کی ہی مخلوق ہیں۔ مخلوق کو اپنا محکوم نہ سمجھے بلکہ خود کو اس کا خادم سمجھے۔ اس طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کی بہترین مخلوق کا خیال رکھتا ہے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ خالق اس کا خیال نہ رکھے۔ اپنے آپ کو عوام کے سامنے جوابدہ سمجھنے کا کام اگرچہ مشکل ہے تاہم بظاہر ایک اور مشکل یہ بھی ہے کہ براہ راست ہر شخص کے سامنے جواب دہی ممکن نہیں ہے ایسی صورت میں اس کے لیئے ایسا نظام وضع کرنا ہو گا جس سے عوام الناس خود کو حکمران کے قریب سمجھیں اور حکمران بھی خود کو ان کے قریب سمجھے۔ نیت ہو تو یہ

مشکل نہیں ہے کیونکہ نیت کے اندر اپنا ایک پیغام ہے جو دوسرے تمام انتظامات سے زیادہ تیز رفتاری سے سفر کرتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اللہ اپنی قدرت کاملہ سے جب کسی سے کام لینا چاہتے ہیں تو لے لیتے ہیں۔ اس کے لیئے کسی کا بزرگ ہونا شرط نہیں ہے بلکہ بقول شخصے قابل ہونا بھی شرط نہیں بلکہ مقبول ہونا شرط ہے اور عین اسی کے مطابق حدیث شریف ہے آپﷺ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ لَیُئَوِیّدُ ھٰذَاالدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرo (مشکوٰۃ شریف) ترجمہ :''بے شک اللہ ضرور بالضرور اپنے دین کی مدد کرواتے ہیں خواہ کسی فاجر سے (ہی کیوں نہ ہو)''۔ اسی طرح بعض ناخواندہ حکمران بھی گزرے ہیں لیکن چونکہ ان کے مشیران و ہم صحبت وہم مجلس علم و فضیلت والے لوگ تھے اس لیئے ان کی حکمرانی میں خلل نہیں آیا۔ خواندگی بھی تحصیل علم کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ کار حکمرانی کا علم بعض حضرات کو وجدانی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ خود قرآن نے حکمران کے لیئے معیار وضع فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: وَقَالَ لَھُمْ نَبِیُّھُمْ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ بَعَثَ لَکُمْ طَالُوْتَ مَلِکًا ط قَالُوْآ اَنّٰی یَکُوْنُ لَہُ الْمُلْکُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْکِ مِنْہُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَۃً مِّنَ الْمَالِ ط قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ط وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌo (سورۃ البقرۃ، آیت ۲۴۷) ترجمہ: اور اُن لوگوں سے ان کے پیغمبر (حضرت داؤدؑ) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے وہ کہنے لگے اس کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہوسکتا ہے حالانکہ ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں اور ان کو تو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی۔ پیغمبرؑ نے جواب میں فرمایا:''(اول تو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلہ میں اُن کو منتخب فرمایا ہے اور (دوسرے) علم اور جسمانی صلاحیت بھی اُن کو زیادتی دی ہے اور (تیسرے) اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو چاہیں

دیں اور (چوتھے) اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے جاننے والے ہیں۔

اگر تاریخ اور اس کے معروف عوامل پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ دنیا کے استحکام کا دارومدار محض اخلاقیات پر ہے۔ اخلاقیات درست سمت میں ہوں تو دنیا اور اس کے اجزا مستحکم ہوتے ہیں اور اگر اخلاقیات میں بگاڑ اور فساد پیدا ہو جائے تو وہی نظام جو چند دن قبل تک نہایت ہی طاقتور مضبوط اور مستحکم دکھائی دیتا تھا اس کو تباہ ہونے میں چند لمحے ہی درکار ہوتے ہیں۔ انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ یہ نظام جو کل تک صدیوں پر محیط تھا وہ کس طرح آناً فاناً نیست و نابود ہو گیا۔ تاریخی عوامل اس کے ناقابلِ تردید گواہ ہیں کہ ایسا اس وقت ہوا جب کہ حکمران خود اور ان کی حکومتوں میں اخلاقی بگاڑ پیدا ہوا۔ جب تک ایسا نہیں ہوا تھا تب تک وہ حکمران اور ان کی حکومتیں مستحکم اور مضبوط رہیں۔

ایک بگاڑ تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس راستے پر چل کر کسی حکمران نے مستحکم نظام قائم کیا ہو وہ حکمران خود اُس راستہ سے ہٹ گیا ہو۔ اس میں کوئی استثنیٰ نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ حکومت اور اس کی قوت کا ایک اپنا نشہ ہوتا ہے جو شراب کے نشے سے سینکڑوں گنا زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ اور جب حکمران کو یہ نشہ چڑھ جائے تو پھر نشے میں لوگ جو کچھ کرتے ہیں اور ان کا جو بھی انجام ہوتا ہے اس کا ہونا لازمی اور ناگزیر ہے۔ اس نشے کی ایک قباحت یہ بھی ہے کہ یہ محسوس نہیں ہوتا جب کہ دیگر نشوں کا احساس ہوتا ہے لیکن جب حکومت نہیں رہتی تو تب پتا چلتا ہے کہ یہ نشہ کیا تھا۔ اس نشے میں ہوتا یہ ہے کہ طاقت کے استعمال میں توازن نہیں رہتا۔ حکماء نے کہا ہے کہ اس توازن کا مقصد یہ ہے کہ طاقت کا استعمال صحیح مقصد کے لیئے، صحیح مقدار میں، صحیح وقت پر اور صحیح طریقہ سے کیا جائے۔ طاقت اور قوت کے

لیئے یہی مشکل ترین مرحلہ ہے۔ ویسے بھی یہ اصول مسلّم ہے کہ قوت فراہم کرنا اور جمع کرنا ایک علیحدہ فن ہے جو نسبتاً آسان ہے جب کہ اس قوت کو اپنے قابو میں رکھنا اور صحیح استعمال کرنا بالکل دوسرا فن ہے اور ہر دو کاموں کے لیئے اُن کی مناسبت سے اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے قوت فراہم کرنے کا کام کیا ہے اُن میں سے اکثر لوگ قوت کو قائم رکھنے اور صحیح استعمال کرنے کی صلاحیت سے تقریباً محروم ہوتے ہیں ''اِلّا ما شاء اللہ''۔ شہنشاہ اکبر کی مثال اس ضمن میں بہت واضح ہے۔ جن جرنیلوں کی مدد سے حکومت حاصل کی گئی تھی انہیں ہر قسم کے اعزازات و انعامات سے نوازا گیا لیکن کارِ حکومت میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ چُن چُن کر اہلِ علم و دانش کے ذریعے حکومت کا کاروبار چلایا گیا۔ یہ ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انسان ایک دائمی سبق سیکھ سکتا ہے۔

دوسری مثال ساسانی حکمرانوں کی ہے۔ ساسانی خاندان جب زوال پذیر ہوا تو کسی دانشمند نے پوچھا ''آپ کے زوال کا باعث کیا ہے؟'' اُس نے کہا ''ہم رات دیر تک جاگتے تھے، شراب پیتے تھے اور صبح دیر سے اٹھتے تھے''۔ ایسی کوئی ایک نہیں سینکڑوں مثالیں ہیں جو کہنے کو تو حکومتوں کے عروج و زوال کی داستانیں ہیں لیکن اصل میں وہ خود حکمرانوں کے اخلاق و کردار کے عروج و زوال کی داستانیں ہیں۔

ان تمام کا مجموعہ قرآن حکیم کی اس ایک مثال سے واضح ہو گا۔ قرآن کریم نے سورۂ روم میں رومیوں کے بارے میں فرمایا کہ ''وہ چند سال میں دوبارہ حکمران ہو جائیں گے'' یہ وہ زمانہ تھا کہ رومی حکمران اور ان کی قوم ذلت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قرآن کریم نے جب چند سالوں ''بضع سنین'' کی بات کی تو صحابہ

کرامؓ نے بضع سنین سے سات یا نو سال مراد لیے۔ بہرحال رومی باوجود ایرانیوں کی کثرت اور قوت کے بہت کم وقت میں پھر غالب آ گئے۔ لیکن دیکھنا یہ مقصود ہے کہ وہ کیسے ہوا۔ وہی حکمران جو شراب کے نشے میں بدمست اور مدہوش ہوتے تھے، کاہلی اور سستی نے ان کو ناکارۂ محض کر دیا تھا، ان کی سب عادات تبدیل ہو گئیں اور وہ بہادروں میں شمار کیے جانے لگے۔ یہ تبدیلی بھی تو اخلاقیات کی ہی تبدیلی تھی ورنہ انسان تو پہلے بھی وہی تھے۔

دُور کی بات نہیں ہے موجودہ زمانے میں بہت سی حکومتیں باوجودیکہ مسلمان نہیں ہیں لیکن مضبوط اور طاقتور ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اُن لوگوں نے وہ سب اصول اپنائے ہوئے ہیں جو دنیا میں طاقت اور استحکام کا باعث ہیں جب کہ اس کے برعکس ہمارا بحیثیت مسلمان کیا حال ہے۔ اگر اس پر غور کیا جائے تو اس میں شک ہے نہ دو رائے کہ آج ہمارے اندر وہ تمام خرابیاں موجود ہیں جو ہر زمانے میں زوال کا باعث رہی ہیں۔

حکمرانی کے بعض اصول تو بنیادی ہیں مگر بعض جزئیات اور حکمت عملی میں حالات و واقعات کے ساتھ تغیر و تبدل ہوا ہے، ہوتا رہے گا اور ہونا بھی چاہیئے۔ اس لیئے اس کا تذکرہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ حکومت کی طرح ہی کوئی بھی کام محض جاننے سے خود بخود عمل پذیر نہیں ہوتا۔ اُس کے پھر اپنے فطری اصول اور قاعدے و ضابطے ہیں جو ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ مسلمان کو اولاً یہ بات معلوم ہونی چاہیئے اور محض علم الیقین نہیں بلکہ حق الیقین معلوم ہونا چاہیئے کہ حکومت دینے اور لینے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے البتہ اُس کا طریقِ کار اپنا ہے۔ جن حضرات کو اچانک حکومت مل جاتی ہے وہ بھی اگر اچھا سمجھیں تو اپنا عقیدہ اسی پر رکھیں۔

چنانچہ یہ آیت غور طلب ہے۔ قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ o ترجمہ: ''آپ فرما دیجیئے کہ اے اللہ جو تمام تر بادشاہی کے مالک ہیں آپ جس کو چاہیں بادشاہی بخش دیں جس سے چاہیں بادشاہی چھین لیں اور جس کو چاہیں عزت دیں اور جسے چاہیں ذلیل کریں۔ تمام بھلائی آپ کے اختیار میں ہے اور آپ ہی ہر چیز پر قادر ہیں''۔ اس پر بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اس کو انہی معنوں میں پوری رضا و رغبت کے ساتھ قبول کر لینا چاہیئے تاکہ اگلی باتیں سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

کچھ لوگ یقیناً یہ سوال کر سکتے ہیں کہ دنیا میں جو مشہور بڑے حکمران ہو گزرے ہیں تو کیا اُن کو بھی حکومت اللہ نے ہی دی۔ تو بالا آیت کے مطابق بالیقین یہی مطلب ہے۔ بلکہ حضرت دانیالؑ اور بخت نصر والا واقعہ تاریخ کے صفحات پر ایک لازوال شہادت ہے۔ ایک اور اصول بھی ہے جو اگرچہ خود بخود روبہ عمل اور کارفرما رہتا ہے پھر بھی اُس کا اہتمام کرنے اور نہ کرنے کے اپنے فوائد اور نقصانات بھی مسلم ہیں اور وہ ہے نظم و ضبط۔ اس میں وقت کی پابندی سرفہرست ہے۔ کائنات کے نظام میں ہر کام کے لیئے ایک وقت مقرر ہے جس میں تقدیم و تاخیر ممکن نہیں اور تمام کام لا محالہ اپنے وقت پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ پاک نے سب سے بڑے فرض نماز کے بارے میں فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا o (سورۃ النساء، آیت ۱۰۳) ترجمہ: ''بے شک ایمان والوں پر نماز فرض ہے مقررہ اوقات پر''۔

اس طرح کائنات کے نظام کے بارے میں وقت کی پابندی کا ذکر

فرمایا:وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُالْعَزِیْزِالْعَلِیْمِo (سورۃ یٰسٓ، آیت ۳۸)

ترجمہ: اور سورج کے لیئے جو مقررہ راہ ہے وہ اُسی پر چلتا رہتا ہے۔ یہ ہے مقرر کردہ غالب، ذی علم (اللہ تعالیٰ) کا۔

پھر اس سے بھی بڑھ کر پورے نظام کی نقل و حرکت کے بارے میں فرمایا:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ o (سورۃ یونس، آیت ۴۹)

ترجمہ: اور ہر امت کے لیئے ایک وقت مقرر ہے۔ پس جب اُن کا معین وقت آ پہنچتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے سرک سکتے ہیں۔

وقت کی پابندی کا اس سے زیادہ اور کیا اصول ہو سکتا ہے۔ اس میں کسی مذہب، زبان یا علاقے کی تخصیص بھی نہیں ہے۔

بلا شبہ ساری کائنات کا نظام ایک مربوط نظم کے تحت چل رہا ہے جس گھڑی اس نظم میں بال برابر بھی فرق آئے گا تو یہ نظام اُسی وقت ختم ہو جائے گا اور وہی قیامت کی گھڑی ہو گی۔ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے اپنی قوم کو یہی سہ نکاتی عالمگیر منشور دیا۔ اسلام کی ساری تعلیمات کا خلاصہ نظم و ضبط ہے۔ اس وقت ہماری قومی زندگی ایک بے ترتیب بلکہ بے ہنگم ہجوم کی عکاسی کرتی ہے۔ جس طرح دین اسلام کا ایک اہم ترین رکن نماز ہے جس کو مقررہ اوقات پر جماعت کے ساتھ مسجد میں پڑھنے کا حکم ہے۔ رکعات، رکوع، سجود، قرأت سب مقرر ہے۔ ان اوقات کی پابندی کرنے والا یقیناً دیگر معاملات میں بھی نظم و ضبط کا مظاہرہ کرے گا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ کائنات کا سارا نظام ایک نظم و ضبط اور وقت کا پابند ہے۔ اس کے متعلق سائنسدانوں کا خیال یہ ہے کہ کائنات کا سارا نظام پچاس ایسی پابندیوں پر مشتمل ہے جن میں سے ایک میں بھی اگر بال برابر فرق آ جائے تو کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جیسے قرآن کریم نے سورج، چاند اور زمین کی مثال دی ہے۔ مثلاً اگر سورج ہی ایک بال برابر بھی اپنی جگہ سے ادھر اُدھر سرک جائے تو سارا شمسی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔ اسی پر بقیہ چیزوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دنیا میں جو بھی ترقی یافتہ قومیں ہیں اُن کے کامیاب وجود کا اصل اور بنیادی سبب نظم و ضبط، خاص کر وقت کی پابندی ہے۔ اس کے علاوہ بھی چند نمایاں خصوصیات ہیں۔ تاہم دوسری اخلاقی خرابیوں کے باوجود وہ قومیں امن و سلامتی کی زندگی بسر کررہی ہیں اور اُن کو کسی فساد کا خوف نہیں۔ اس کی بس یہی وجوہات ہیں جب کہ مسلمان ملکوں میں بالعموم اور ہمارے ہاں بالخصوص دوسری کمزوریوں کے علاوہ اسی ایک بات کی بے حد کمی ہے جس کے باعث ہم دنیا میں ایک طرح کی رسوائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ستم یہ ہے کہ ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوئی شعوری کوششیں بھی کی جانی دکھائی نہیں دیتیں۔ بدترین یہ کہ جو ان خرابیوں کو دور کرنے کے دعویدار تھے وہ سب خود ان خرابیوں کو پھیلانے کا کام کر رہے ہیں۔

سورج جیسی قوی ہیکل چیز بھی ایک قاعدہ کی پابند ہے۔ بلکہ اُس سے کئی گنا بڑے سیارے بھی نظم و ضبط کے پابند ہیں۔ یہ سب ایک نظم کے تحت چل رہے ہیں اور اس طرح وقت کے پابند ہیں کہ مقررہ نظم کی خلاف ورزی کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کے عقیدہ وایمان سے ہٹ کر عمومی گمان بھی یہی ہے کہ جس دن نظم کی پابندی نہیں ہو گی وہ دنیا کے خاتمہ کی گھڑی ہوگی۔ دنیا میں

کامیابی، عدل و انصاف اور امن سے چلنے والے تمام تر معاملات اسی طرح وقت کے پابند ہیں بلکہ وقت کی پابندی ہی ان کی خصوصیت اور امتیاز ہے۔ سب کے ہاں وقت سے زیادہ کوئی قیمتی چیز نہیں جب کہ ہمارے ہاں سب سے زیادہ بے قیمت اور ردی چیز وقت ہے جس کو ضائع کرنا عین ثواب سمجھا جاتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ بھی وہی ہے۔ وقت کی پابندی نہ کرنے سے ذہنی اور جسمانی افرا تفری کے علاوہ وسائل اور ذرائع کس قدر ضائع ہوتے ہیں اس کا تو اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ آج کل ہمارے ہاں جو وسائل ضائع ہوتے ہیں وہ چار سو فیصد سے زیادہ ہیں اور یہ محض اس لیئے ہے کہ ہمارے ہاں وقت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے اس پر علیحدہ طور پر کسی وقت لکھوں گا۔ اس وقت مناسب ہے کہ ایک واقعہ کا ذکر کر دوں جو دلچسپی سے خالی نہ ہو گا اور اس مسئلے کو کہ وقت ضائع کرنا ہمارے پورے معاشی نظام کو کیسے مضرو نقصان دہ بنا دیتا ہے، سمجھنے میں مدد دے گا۔ ضیاء الحق مرحوم کی موجودگی میں ڈیفنس کالج میں ایک سیمینار کے دوران میں نے اس پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی تھی۔ ڈیفنس کالج میں جب میں نے یہ کہا کہ دفاع پر اخراجات میں اضافہ کرنے کی بجائے ہمارے جو وسائل ضائع ہوتے ہیں وہی اگر بچا لیئے جائیں تو مزید مطالبہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس پر جو بھی بحث ہوئی مگر جنرل صاحب نے خود اپنے گھر کی مثال بھی دی کہ وسائل کیسے ضائع ہوتے ہیں۔

یاد آیا کہ انہی دنوں غلام اسحاق خان صاحب نے خسارے کا بجٹ پیش کیا تو میں نے اُس بجٹ کے خلاف ایک بیان دیا تھا اور کہا تھا کہ اُن کو قید کریں تو بجٹ کا سارا خسارہ میں پورا کر دوں گا۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ وہ کیا معجزہ ہے جس سے یہ خسارہ جو اس وقت غالباً پانچ ارب روپے تھا وہ پورا ہو جائے گا۔ میں نے کہا جنرل صاحب زیادہ نہیں مگر محض دو تین بڑے

آئیٹم ہیں اُن پر غور کیجیئے۔ ایک بڑا آئیٹم جس پر سب سے زیادہ ضیاع (wastage) ہوتا ہے وہ بڑے منصوبوں کا وقت پر مکمل نہ ہونا ہے جس کا عام نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک منصوبہ ایک یا دو کروڑ روپے کے تخمینے سے ایک سال کی مدت کے لیئے تیار کیا جاتا ہے لیکن جب وہ کبھی مکمل ہوتا ہے تو اس پر ایک سال کے بجائے پانچ بلکہ بسا اوقات دس سال لگ گئے ہوتے ہیں اور وہ ایک یا دو کروڑ سے بڑھ کر تیس چالیس کروڑ روپے پر پہنچ جاتا ہے۔ کوئی اتھارٹی اس کا نوٹس ہی نہیں لیتی کہ ایسا کیوں ہے۔ اس کا جو نقصان ہے اس کا اندازہ کیسے لگے گا۔ اس پر متضاد یہ کہ وہ منصوبہ ابھی مکمل نہیں ہو پاتا کہ اس کی مرمت شروع ہو جاتی ہے کیوں کہ وہ اکھڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح قومی دولت کا ستیاناس ہوتا رہتا ہے۔ دوسرا بڑا جُز کسٹم و ایکسائز میں بدنظمی ہے۔ پھر میں نے سمگلنگ کا ذکر کیا۔ اس کے علاوہ میں نے ٹیکس کی وصولی کا ذکر کیا۔ وقت کے ضیاع کا نقصان ان سب سے بڑھ کر ہے اگر انسان کو وقت کی پابندی کی افادیت کا احساس ہو گا تو وہ نہ صرف وقت کو ضائع ہونے سے بچائے گا بلکہ اس سے زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی نظم و ضبط پیدا ہو گا جو اچھی حکمرانی کی بنیاد بھی ہے اور ثمر بھی۔

حکمرانی کے لیئے صلاحیت

حکمرانی کے لیئے صلاحیت کا ہونا بھی اچھی حکمرانی کی ضروریات میں سے ایک ہے۔ مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ جب حضرت ابو ہریرہؓ نے یمن کا گورنر بننے کی خواہش کی تو نبیﷺ نے ان کی اس خواہش کو قبول نہ فرمایا جب کہ حضرت ابوہریرہؓ کے زہد و تقویٰ سے کون واقف نہیں جنھوں نے پوری زندگی دین کے لیئے وقف کر رکھی تھی اور سائے کی طرح ہمہ وقت رسول اللہﷺ کے ساتھ رہتے تھے اور علم حدیث پر گہری دسترس رکھتے تھے۔ کارِ حکومت اور انتظامی صلاحیت کا حامل ہونا ایک چیز ہے اور صاحبِ تقویٰ ہونا دوسری چیز ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ جو آدمی صاحب تقویٰ ہو وہ اُسی طرح انتظامی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ اسی لیئے جن حضرات کو حضورﷺ نے کارِ حکمرانی کے لیئے منتخب فرمایا وہ اسلام سے قبل بھی کارِ سیاست میں ممتاز تھے۔ جس طرح ضروری نہیں ہے کہ ہر مسلمان ڈاکٹر ہو یا انجنیئر ہو اسی طرح بالکل ضروری نہیں کہ ہر متقی شخص سیاست کا بھی ماہر ہو۔ بلکہ دنیا میں جو بھی سیاسی علم کے ماہر استاد ہیں ان میں کوئی ایک بھی عملی سیاستدان نہیں ہے۔

اگر مسلم کانفرنس کے کارکنوں کو اس بات کا یقین ہے کہ مسلم کانفرنس کم از کم نظریاتی طور پر ریاستی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے جو اسلامی قدروں کا لحاظ رکھتے ہوئے انسانیت کی خدمت اور تحریک آزادئ کشمیر کے لیئے سرگرم عمل ہے تو ان کا یقین کسی بھی صورت متزلزل نہیں بلکہ کامل ہونا چاہیئے۔ اور توفیق الٰہی سے جب یقین جیسی نعمت ہاتھ آ جائے تو جماعت کی نیک نامی اور کامیابی میں ہر کارکن

مشکلات کے باوجود گراں قدر خدمات انجام دے سکتا ہے۔ جیسا کہ علامہؒ نے کہا ہے:

؎ جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ایک مرتبہ پاکستان کے دورے پر آئی ہوئی برطانیہ کی ڈیفنس کالج کی ایک ٹیم نے مجھ سے پوچھا کہ آپ عرصہ دراز سے کامیابی کے ساتھ سیاست میں ہیں اس کی کیا وجہ ہے۔ میں نے جواباً کہا:

۱: ''میں نے سیاست میں کبھی غلط وعدہ نہیں کیا''۔ انھوں نے کہا یہ بہت مشکل کام ہے۔

۲: دوسری بات میں نے یہ کہی کہ'' میں ایک متوسط گھرانے کا آدمی ہوں لیکن میں نے اپنی اس پوزیشن کو بدلنے کی کبھی خواہش یا کوشش نہیں کی''۔ اس پر انھوں نے کہا یہ اور بھی مشکل کام ہے۔

۳: پھر میں نے تیسری بات یہ کہی کہ ''میں نے سیاست میں کبھی اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا''۔ برٹش ٹیم کے اُن اراکین نے کہا یہ سب سے مشکل کام ہے۔ یہ بھی ذکر کردوں کہ شخصیت سازی کی اصلِ اصول اپنے نظریات اور اصولوں پر استقامت کے ساتھ قائم رہنا ہے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اصحابِ اقتدار کو دورانِ اقتدار ان باتوں پر بہر صورت کاربند رہنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ان سب معاملات کا

ایک بنیادی عنصر اخلاقیات ہے اور ہر معاملہ کی اپنی الگ اخلاقیات ہیں۔

اخلاقیات کی بات اس لیئے بھی اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود حضورﷺ کے بارے میں فرمایا ''بے شک آپﷺ عظیم اخلاق کے مالک ہیں''۔ اور یہ اخلاق ہی تو تھے کہ کپڑوں میں لپٹی ہوئی ٹوٹی پھوٹی تلواریں لیکر مٹھی بھر لوگ نکلے اور ایک دنیا کو فتح کر لیا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ سامنے تو اگرچہ تلوار ہی تھی لیکن اُس تلوار کے پیچھے کائنات کی تمام تر اخلاقیات کی قوت تھی ورنہ بحثیت انسان تو ان میں اور مخالفین میں کچھ فرق نہیں تھا۔

خود قرآن کریم نے صرف اللہ کے حبیبﷺ کے متعلق ہی نہیں بلکہ اُن کے کامیاب اطاعت گزاروں کی اخلاقیات کے بارے میں بھی بار بار ذکر کیا ہے۔ اور اُن سب حضرات نے اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ اس پر ایک علیحدہ کتاب لکھ رہا ہوں اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا۔

اخلاقیات میں دو اہم بنیادی پہلو ہیں۔ ایک اپنوں کے ساتھ سلوک اور دوسرا مخالفین کے ساتھ سلوک۔ مخالفت میں اکثر بڑے چھوٹے لوگ بلا تکلف دشمنی کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو انتہائی غلط ہے۔ دشمنی کا لفظ صرف ان ہی کے لیے ہے جن کو اللہ نے دشمن قرار دیا ہو اگرچہ اس پر عمل کرنے پہ بھی کافی قید و بند ہے۔ جب کہ ہمارے معاشرے میں اس کا استعمال بھی لفظ ''منافق'' کے استعمال کی طرح بالکل بے قید ہوتا رہتا ہے۔ بہرحال سرِدست اول الذکر دو بنیادوں کے بارے میں ہی بات کرتے ہیں۔

اپنوں سے مراد رشتہ دار بھی ہیں اور ہمدرد و ہم خیال اور ہمرکاب ساتھی بھی ہیں۔ اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے اس میں مزید تخصیص فرما دی۔ اس میں نسبی رشتے اور پڑوسی بھی شامل فرما دیئے۔ ان کے لیے علیحدہ اخلاقی ضابطہ مقرر فرما دیا جس کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ کریں گے۔ باقی رہے وہ لوگ جو کسی نہ کسی وجہ سے مخالف ہو جاتے ہیں اُن کے لیے بھی اللہ اور اُس کے رسول اللہ ﷺ نے مزید واضح ضابطہ مقرر فرما دیا۔ ہمارے ہاں اخلاقیات کی عملی اور فکری تعلیم و تربیت نہ ہونے کے باعث ہم اختلاف رائے اور مخالفت و دشمنی میں کوئی تمیز نہیں کر پاتے۔ ہمارے پورے معاشرے میں خواہ دین ہو یا سیاست دونوں کے نام پر دشمنی کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ مزید خرابی یہ ہے کہ اس کو کم کرنے کی کوشش سرے سے نہیں ہے بلکہ اس پر تیل چھڑکنے کا کام پوری محنت کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ ان دونوں بنیادی امور میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ارشاد کیا ہے۔ بلکہ بے ادبی نہ ہو تو یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ مغرب کے لوگ جن کو ہم بُرا بھلا کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم تو جنت میں جائیں گے اور وہ جہنم میں ذرا اُن کے ساتھ تقابل کر کے دیکھیں کہ اُن کا کردار کیا ہے۔ اُن کی بعض نمایاں خرابیاں اپنی جگہ مگر یہ کہ وہ لوگ اخلاقیات کے بعض بنیادی اصولوں پر کس طرح سختی سے عمل کرتے ہیں جب کہ ہمیں اس کا احساس بلکہ شعور بھی نہیں رہا اور دراصل یہی وہ امر ہے جو مغرب کے لوگوں کی سلامتی اور طاقت کا باعث ہے۔

اخلاقیات کا سب سے اہم حصہ اختلاف رائے رکھنے والے مخالفین کے بارے میں سلوک ہے۔ اس بارے میں اللہ پاک نے کیا فرمایا ہے اُس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ نے جب فرعون کے پاس سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تو فرمایا:

وَقُوْلُوْا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ترجمہ: ''اور اُس کے ساتھ نرمی سے بات کرو''۔ فرعون سے بڑا مخالف بلکہ دشمن کون تھا۔ مگر پیغمبرانہ طرزِ عمل کے لیئے اللہ پاک نے انسانی عظمت کی بات کی۔ ذرا اپنے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ کیا ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ خاص کر جب کہ ہمارے مقابلے میں کوئی فرعون بھی نہیں ہے بلکہ ہم خود ہی ایک دوسرے کے مدِّ مقابل ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کے اس مزید واضح ارشاد پر غور کریں جو قرآن کریم میں ہے اور ہمارے ایمان کا حصہ ہے: وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَاِنَّ ذَالِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ o ترجمہ: ''جس نے صبر کیا اور درگزر کیا تو یہ بہت بڑے معاملات میں سے ہے''۔ صبر کے دو پہلو ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ کسی مخالفانہ امر پر صبر کرے یعنی برداشت کرے۔ قرآن کریم نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ فرمایا ''وَغَفَرَ'' یعنی معاف کر دیا اور درگزر کیا۔ قرآن کا لفظ ''غَفَرَ'' بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے مگر کم سے کم جس سے گزارا ہو سکے وہ معاف کرنا اور درگزر کرنا ہے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ عمل یعنی صبر کرنا اور درگزر کرنا بالکل یکطرفہ عمل ہے۔ یعنی اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ مخالف نے کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ معذرت کی ہو۔ مطلب یہ بھی ہے کہ گویا مخالفت کرنے والے کے بارے میں یہ بھی یاد نہ رہے کہ اُس نے مخالفت کی تھی۔ یہ ذرا اور مشکل ہے لیکن اللہ کسی کو نصیب کرے تو صبر اور غفر کا اعلیٰ مقام یہی ہے۔

اس صبر کرنے کا انعام دیکھیئے: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ دنیا و آخرت میں اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔ اللہ کے کرم سے ایک بار جب میں ایک بلند مرتبہ ولی اللہ کی خدمت میں بیٹھا تھا تو میں نے ایک ساتھی کے ساتھ کسی بات پر قدرے ناراضگی سے بات کی تو اللہ کے اُس

دوست نے سخت سرزنش کی اور فرمایا ''اگر ایمان کی ضرورت ہے تو کوئی گالی بھی دے تو اُس کے خلاف دل میں بھی خیال نہیں کرنا'' کچھ عرصہ تک وہ مجھے یہ بات یاد دلاتے رہے یہاں تک کہ اللہ کا کرم ہوا اور دل صاف ہو گیا۔

اگر کوئی بھی شخص بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنے کیئے پر نادم ہو تو اُس کے بارے میں یہ آیت مبارک بڑی رہنمائی مہیا کرتی ہے۔ میں تو ان دونوں ارشادات کا مطلب یہ سمجھتا ہوں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش میں رہا ہوں کہ اختلاف کرنے والے سے نہ صرف درگزر کیا جائے بلکہ اس کو یہ بھی معلوم نہ ہونے دیا جائے کہ وہ مخالفت کرتا تھا۔ یہ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس پر اتنی شفقت کی جائے کہ خود اُس کو بھی یاد نہ رہے کہ وہ مخالفت کرتا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوْاللّٰهَ وَسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُواللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔ ترجمہ: ''اور کیا ہی اچھا ہوتا کہ جب اُن سے برائی کا ارتکاب ہو گیا تھا وہ آتے آپؐ کے پاس وہ اللہ سے بھی اپنے لیے معافی مانگتے اور آپؐ بھی اُن کو اللہ تعالیٰ سے بخشواتے۔ تو وہ پاتے اللہ تعالیٰ کو معاف کرنے والا توبہ قبول کرنے والا''۔

اس آیت مبارکہ میں اگرچہ خطاب نبیﷺ سے ہے لیکن اس میں ایک ابدی اصول بھی وضح کر دیا گیا ہے۔ اگر کوئی معذرت کرتا ہے یا نادم ہوتا ہے یا غلطی پر پشیمان ہوتا ہے تو انسانی عظمت کا تقاضا ہے کہ اُس کی غلطی بھی یاد نہ رکھے مگر اپنی کوشش کے علاوہ یہ بات اللہ کی توفیق سے ہی ہوسکتی ہے۔ غلطی کرنے اور معاف کرنے میں کوئی حد نہیں۔

اب دیکھیئے کہ رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے بارے اللہ کے رسول ﷺ کا کیا ارشاد ہے۔ پڑوسیوں کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَازَالَ جِبْرائِيلُ صَلَوٰةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ۔ ترجمہ: ''ام المومنینؓ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ رہے جبرائیل اللہ کی رحمتیں ہوں ان پر وصیت کرتے مجھے ہمسایہ کے ساتھ احسان کی یہاں تک کہ گمان کیا میں نے کہ وارث ٹھراویں گے ان کو ہماری میراث میں''۔

اسی طرح رشتہ داروں کے بارے میں ایک طویل حدیث مبارک ہے جس کو ''صلہ رحمی'' والی حدیث کہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو وَعَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلُ الَّذِيْ اِذَا انْقُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا۔ ترجمہ: ''روایت ہے عبداللہ بن عمرو سے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا صلہ رحم کرنے والا وہ نہیں کہ بدلہ دے نیکی کا بلکہ وہ ہے کہ جب اس سے تعلق توڑا جائے تو وہ اُس کو جوڑے''۔ صلہ رحمی کے ضمن میں متعدد احادیث کے اندر ذکر کیا گیا ہے جو قدرے تفصیل سے ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیئے ایک حدیث شریف کا خلاصہ درج ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو تجھے حق سے محروم کرے تو اس کو دے۔ اگر وہ تجھ سے رشتہ توڑے تو اُن کے ساتھ جوڑ۔ اگر وہ ظلم کرے تو آپ اُن کو معاف کر دیں۔ اگر وہ برائی کرے تو اُن کے ساتھ اچھائی کرے۔ کسی عارف کا قول ہے:

بَدی را بَدی باشد سھل جزا اگر مَردی احسن الی من اَساء

برائی کا برائی سے جواب دینا تو آسان بدلہ ہے اگر تو مرد ہے تو جو تیرے ساتھ

برائی کرے تو اس کا بدلہ اس سے بہتر اچھائی میں دے۔

میری خواہش ہے کہ میں اُن چند باتوں کا ذکر بھی کروں جن کے باعث غیر مسلم اقوام اور ممالک اسلام کے نقطۂ نظر سے کئی ناپسندیدہ اعمال و افعال کے ارتکاب کے باوجود طاقتور ہیں، پرامن زندگی گزارتے ہیں اور خوشحال اور مستحکم ہیں۔ ان اقوام کے استحکام وخوشحالی کی بڑی وجہ ان کا جھوٹ، بددیانتی اور خیانت سے دور ہونا ہے۔ وہ تمام خرابیاں جو کسی بھی فرد یا قوم کے زوال کا باعث ہوسکتی ہیں اُن میں سب سے بڑی خرابی جھوٹ ہے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کا ہی ارشاد نہیں ہے بلکہ موجودہ ترقی یافتہ قوموں میں بھی جھوٹ بولنا سب سے بڑا جرم ہے۔ بعض مقامات پر تو جھوٹ نہ بولنا تو الگ بات ہے وہ یہ بھی نہیں مانتے کہ کوئی شخص جھوٹ بول بھی سکتا ہے۔ جھوٹ تمام خرابیوں میں سرفہرست ہے۔ اس لیئے اس کے تدارک پر وہ لوگ زیادہ پختگی کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد مبارک پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے:

اِنَّ الصِّدْقَ یُنْجِیْ وَالْکَذِبَ یُھْلِکُ (الحدیث)

ترجمہ: بے شک سچائی نجات دلاتی ہے اور جھوٹ ہلاک کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں جھوٹ سے بڑا گناہ کوئی نہیں ہے۔ اور جھوٹ سے ہی اللہ پاک کو غصہ آتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ط اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًاo (سورۃ الکھف، آیت ۵) ترجمہ: ''سب سے بڑی بات جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے وہ صاف جھوٹ ہے۔'' آیت بالا سے ثابت ہوا کہ جھوٹ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ قابل نفرت گناہ ہے۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا مسلمان

چور ہو سکتا ہے آپﷺ نے فرمایا ہاں، پھر اُس نے پوچھا کیا مسلمان زانی ہو سکتا ہے آپﷺ نے فرمایا ہاں' پھر اُس نے چند اور بڑے بڑے گناہ گنوائے آپ نے سب کا جواب ہاں میں دیا آخر میں پوچھا یا رسول اللہﷺ کیا مسلمان جھوٹا ہو سکتا ہے تو آپﷺ نے فرمایا نہیں۔ اسی طرح جھوٹ مسلمان کی شان کے منافی ہی نہیں ہے بلکہ اللہ کریم نے قرآن مجید کے اندر جھوٹ بولنے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ لعنت خداوندی کا مطلب ہے کہ جو جھوٹ بولتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی رحمت سے محروم رہتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر آپﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بعض لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان پر لعنت کرتا ہے''۔ (الحدیث) اس حدیث کے مفہوم میں محدثین نے فرمایا ہے کہ قرآن کی لعنت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی تلاوت قرآن میں یہ کہتا ہے کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہے مگر وہ خود جھوٹ بولتا ہے۔ یہ بھی وہ پڑھتا ہے کہ خبردار ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔ مگر وہ خود عوام الناس پر ظلم کرتا ہے۔ اسی طرح ایک اور صحابیؓ نے کہا یارسول اللہﷺ مجھے کسی ایک ایسے عمل کی وصیت فرمائیں کہ وہ کرنے سے تمام گناہوں سے جان چھوٹ جائے۔ آپﷺ نے فرمایا جھوٹ ترک کر دو تمام گناہوں سے گلو خلاصی ہو جائے گی۔ انصاف جو انسانی زندگی کو قائم رکھنے کے لیئے ضروری ہے، اس کی بنیاد بھی جھوٹ نہ بولنے اور سچ کہنے پر ہی مبنی ہے۔ مغربی یا غیر مسلم ممالک کے ہاں عدالتیں ہوں، ریاست ہو یا فرد سب ہی لوگ انصاف پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم بھی ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ جنت کے دعویدار ہونے کے باوجود ہمارا کیا حال ہے۔ اسی طرح دوسرے کے حق کو تسلیم کرنا بھی ایسا اصول ہے جو معاشرے میں اطمینان، سکون اور استحکام پیدا کرتا ہے بلکہ اس کے بغیر کسی بھی معاشرے میں سکون ممکن نہیں ہے۔ دنیا میں جتنے بڑے لوگ گزرے ہیں اُن سب

میں اس نوعیت کی کئی باتیں مشترک تھیں سوائے ہٹلر کے کہ اُس نے جھوٹ بولنے کو سرکاری سطح پر رواج دیا پھر اس کا جو حشر ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے وہ بنیادی امر جس نے مغربی حکومتوں کو مستحکم بلکہ طاقتور رکھا ہے، نظم و ضبط ہے۔ جہاں کہیں بھی اس وقت استحکام ہے وہ سب کا سب نظم و ضبط کی وجہ سے ہی ہے۔ بظاہر تو یہ لفظ ایک عام بلکہ عمومی دکھائی دیتا ہے مگر کسی بھی فرد، قوم، جماعت یا ملک کی مضبوطی اور استحکام کے لیئے یہ ایک بنیادی پتھر ہے جس کے بغیر کسی قسم کا استحکام ممکن نہیں ہے۔ پاکستان کا وجود خود نظم و ضبط کی لا زوال مثال ہے۔ آج ہم جس افراتفری کا شکار ہیں اور طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہیں جس سے مستقبل بھی غیر یقینی ہوتا جا رہا ہے اس کی بڑی اور بنیادی وجہ بھی صرف اور صرف یقین کی کمی اور نظم وضبط کا نہ ہونا یعنی بدنظمی ہے۔ آج ہماری زندگی کے کسی حصہ میں نظم و ضبط نہیں ہے۔ بالکل یہی وجہ ہے کہ نہ گھروں میں سکون ہے نہ باہر۔ قائداعظم نے جو کہا تھا ''یقین، اتحاد اور نظم و ضبط'' تو ان تینوں کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ اگر یقین ہو گا تو اتحاد بھی ممکن ہے اور نظم و ضبط بھی۔ پھر اتحاد کے لیئے بھی یقین کی ضرورت ہے اور اتحاد خود بھی ایک نظم و ضبط کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسی طرح اگر نظم وضبط ہو گا تو یقین اور اتحاد خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ بعض موجودہ اقوام اور ممالک نظم وضبط کی زندہ مثالیں ہیں اور اسی وجہ سے وہ دنیا میں مستحکم ہیں، باعزت ہیں اور دوسروں کے محتاج نہیں ہیں جب کہ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کتاب کے ساتھ ہر نعمت اور صلاحیت موجود ہے لیکن اس دنیا کی بد ترین اور مغلوب قوم ہم ہیں۔ اگر آج ہمارے اندر محض نظم و ضبط ہی پیدا ہو جائے تو ہمیں کسی قسم کی کوئی محتاجی نہیں رہتی

بلکہ دوسروں کی امداد کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد ریاست و حکومت کے کاروبار میں اہل الرائے ساتھیوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے، ظاہر ہے، کہ حضورﷺ کے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر بھی آپ عقل و دانش، علم و فہم اور بصیرت میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے۔ ظاہر ہے کہ جو ہستی عقل و فہم، علم و دانش اور بصیرت کے اس رتبہ پر ہو اس کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی بایں ہمہ آپﷺ مشورہ کرتے تھے۔ قرآن کریم میں بھی دو مرتبہ مشورہ کرنے کا حکم آیا ہے۔ تو پھر اور کون ہے جو مشورے کے اصولوں سے صرف نظر کرے اور اچھائی کی توقع کرے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ بسا اوقات ایک عام شخص نے جب اہم معاملہ پر کوئی مشورہ دیا تو وہ باقی تمام مشوروں پر صائب تھا۔ پرانے بزرگ فرماتے تھے کہ اگر مشورہ کرنے کے لیئے کوئی موجود نہ ہو تو لاٹھی پر اپنی پگڑی رکھ کر اُس سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ پھر فرمایا کہ مشورہ اہل سے کریں اور بے غرض آدمی سے مشورہ لیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ حکم دیا ہے۔ وَشَاوِرْ هُمْ فِی الْاَمْرِ o (سورۃ ال عمران) ترجمہ: ''اے رسولﷺ! اپنے رفیقوں سے مشورہ کریں''۔

چنانچہ حضورﷺ نے اس پر بہ نفس نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل کرنے کی ہدایت فرمائی، انھوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ o (سورۃ شوریٰ) ترجمہ: ''یہ لوگ اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں''۔ اس طرح مشورہ دینے والے کے بارے میں آپﷺ نے فرمایا کہ ''وہ امین ہے'' اور امانت کی جس

قدر تاکید بیان فرمائی گئی ہے وہ بھی قابل توجہ ہے۔ فرمایا: اِنَّ الْمُسْتَشَارَ مُؤْتَمِنٌ ''تحقیق جس سے مشورہ لیا گیا ہے وہ مشورہ کے معاملہ میں امین ہے'' (الحدیث) قرآن کریم نے دو مرتبہ اہل مشورہ کی اہمیت و اہلیت کو بیان فرمایا اور دونوں مقامات پہ ارشاد فرمایا کہ ''اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو''۔ اس عمل کا مفاد یہ ہے کہ جو شخص بھی مشورہ کرتا ہے وہ اگر کسی معاملہ میں نا کام بھی ہو تب بھی اس ناکامی کا گہرا اثر نہیں ہوتا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ حکمران مشورہ تو کرتے ہیں لیکن علم و فکر میں اپنے سے کمتر افراد کے ساتھ جو محض ہاں میں ہاں ملا سکتے ہیں۔ کیوں کہ صحیح مشورہ دے کر وہ حکمران کو ناراض نہیں کر سکتے۔ حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے گرد اُن لوگوں کو پسند فرماتے تھے جو حکومت پر تنقید کرتے تھے۔ ایک صحابیؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ یہی میرے دوست ہیں کیونکہ یہ میری خرابیوں سے مجھے آ گاہ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو نہ صرف اس کا رواج نہیں ہے بلکہ اگر کوئی ساتھی اختلاف کرے تو اس کو جان و مال کی امان طلب کرنا پڑتی ہے جو کبھی ملتی ہے کبھی نہیں ملتی۔ مشورہ کے بارے میں دو اہم امور ہیں۔ ایک یہ کہ مشورہ طلب کیا جائے جس کو اللہ تعالیٰ نے فرض کر دیا۔ دوسرا یہ کہ جس سے مشورہ پوچھا جائے وہ اپنی ذات کو منہا کر کے مشورہ دے۔ اس کی مثال میں نے قائد ملّت چودھری غلام عباس صاحب میں دیکھی تھی۔ مشورہ دینے والا اگر مشورہ لینے والے کو خوش کرنے کی خاطر غلط مشورہ دے گا تو یہ بد دیانتی ہے۔اور اگر اپنی کسی غرض کے باعث ایسا مشورہ دیا گیا تو یہ بددیانتی سے بھی بُری بات ہے۔

اچھی حکمرانی کے چند اصول

اچھی حکمرانی کی خصوصیات اور اس کے لوازمات کا اجمالی خاکہ پہلے بیان کردیا گیا ہے تاہم اچھی حکمرانی کے لیئے چند بنیادی اصولوں کو اختصار سے اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

۱: **بے غرض حکمرانی**

نہ صرف موجودہ دور میں بلکہ ہر دور میں ایک اچھے حکمران کی خوبی یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اگر بالکل بے غرض نہ ہو تب بھی کم از کم اپنی اغراض کی حد بندی کر دے۔ کیونکہ اس کی ایک خود غرضی پورے معاشرے کو اسی خرابی میں مبتلا کر دیتی ہے۔

۲: **ذاتی پسند و نا پسند**

حکومتی کاموں میں ذاتی پسندو ناپسند کو قریب نہ آنے دے۔ یہی ذاتی پسندو ناپسند درحقیقت بے انصافی کی پہلی اینٹ ہے۔ کوئی گالی دے تب بھی اس کے ساتھ انصاف کرنے میں دریغ نہ کرے نہ ہی تعریف کرنے کی بنیاد پر انصاف کا پلڑا جھکا دے۔

۳: **تنقید**

تنقید کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔ بلکہ تنقید کرنے والوں کو دعوت دے اور حکومت کو بالکل عارضی چیز سمجھے۔ تنقید کرنے والوں پر ناراض نہ ہو اور نہ ہی ان

کے مواخذہ کے بارے میں سوچے۔ ایسا کرنے سے حکمران کے دل و دماغ میں وسعت پیدا ہوتی ہے جو بجائے خود بہت بڑی خوبی ہے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے عین مطابق ہے ''وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ'' ترجمہ: ''اور جس شخص نے صبر کیا اور معاف کیا بے شک یہ بڑے کاموں میں سے ہے''۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یا رب آپ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا بندہ کون ہے فرمایا کہ جو انتقام کی طاقت رکھتا ہو اور معاف کر دے اور یہ سمجھے کہ انتقام لینا صرف اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے۔ بندہ معاف ہی کر دے تو اس کی اسی میں عظمت ہے۔

۴: مطالعہ

مطالعہ جاری رکھے۔ قلّت وقت کا محض بہانہ ہوتا ہے۔ اگر شوق ہو تو کسی بھی حالت میں مطالعہ کو کسی نہ کسی درجے میں جاری رکھا جا سکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ علم کی معروف خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک حالت میں نہیں رہتا۔ اس کی سطح بڑھے گی یا کم ہو گی۔ مطالعہ نہ ہو تو پڑھا ہوا بھی کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ عربوں کا معروف محاورہ ہے ''اَلْعِلْمُ يَزِيْدُ بِالتَّكْرَار'' ترجمہ: علم مذاکرے کے ساتھ بڑھتا ہے''۔ (الحدیث)۔ کسی دور میں مذاکروں کا بہت رواج تھا۔ خاص کر حدیث مبارک کے مذاکرے تو روز مرّہ کا معمول تھے۔

۵: اہلِ علم کی مجلس

باقاعدگی کے ساتھ اہلِ علم کی مجلس اختیار کرے خواہ وہ علماء ہوں، دانشور اور اسکالر ہوں یا تجربہ کار لوگ ہوں۔ تاہم اپنے سے بہتر لوگوں کی مجلس تلاش کرے۔ کیونکہ مجلس سے جو کچھ سیکھا جا سکتا ہے وہ درجنوں کتابیں پڑھنے سے بھی ممکن

نہیں۔ مجلس کے بارے میں بے شمار واقعات، تجربات اور دانشمندوں کے اقوال ہیں مثلاً سعدیؒ نے فرمایا ''صحبت صالح ترا صالح کند، صحبتِ طالح ترا طالح کند''۔ مولائے رومؒ نے فرمایا:

؎ یک زمانہ صحبتِ بااولیاء، بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

علم کے لیئے مذاکرے کی ضرورت تمام اہلِ علم میں معروف ہے۔ مولائے رومؒ نے کئی مثالیں دی ہیں۔ بھیڑ اور شیر کے بچے کی صحبت کا خاص ذکر کیا ہے۔ علامہؒ نے کوّے کی صحبت کا ذکر کیا ہے۔ اگر کسی عارف کی صحبت نصیب ہو تو اُسے اپنی خوش بختی سمجھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ یہ تمام معمولات جن کا ذکر کیا گیا ہے یا جن واقعات کا میں نے اس کتاب کے اندر اعادہ کیا ہے یہ تمام امور میں نے خود بھی کیئے ہیں محض سنی سنائی بات بیان نہیں کی۔

ان باتوں کا لبِ لباب یہ ہے کہ اچھی صحبت تلاش کرے۔ اہلِ علم کی ہو یا اہل ذکر کی جیسا کہ قرآن کریم میں دو مقامات پہ ارشاد فرمایا کہ ''اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو''۔ اگر قسمت سے ایسی صحبت نصیب ہو کہ جس سے تقدیر ہی بدل جاتی ہے تو وہ تمام غموں کا مداوا اور تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ اسی پر علامہ نے کہا: ؎ ''ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں''۔ اس سے ہوتا کیا ہے اس کی بھی ایک مثال بے محل نہ ہو گی۔ ایسے ہی ایک اہل ذکر کے ساتھ میرا مختصر سا سفر تھا۔ میں نے کسی کے ساتھ شکایت کے انداز میں ذرا غصے سے بات کی۔ وہ فرمانے لگے آپ کو ابھی تک غصہ آتا ہے۔ اگر ایمان کی ضرورت ہے تو کوئی گالی بھی دے تب بھی اس کے خلاف دل میں بھی خیال نہ کریں۔ چند ماہ بعد تک وہ مجھے یاد

دلاتے رہے۔ پھر اللہ نے کیا کہ گالی اور تعریف دونوں ہی میرے لیئے ایک جیسی ہو گئیں۔ الحمد لله رب العالمين۔

۶: سیکھنا اور علم میں اضافہ کرنا

ایک نہایت ہی ضروری امر سیکھنا (کسی چیز کا علم حاصل کرنا ہے) جب لوگ کسی بڑے مرتبے یا منصب تک پہنچ جاتے ہیں تو ان کے لیئے سیکھنا ایک طرح سے توہین آمیز معاملہ دکھائی دیتا ہے۔ خواہ مرتبے کی وجہ سے ہو یا علم کی وجہ سے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص نہ صرف جاہل کا جاہل ہی رہتا ہے بلکہ اس کی جہالت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جب حکومت نااہل اور جاہل لوگوں کے ہاتھ آجائے تو پھر رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق قیامت کا انتظار کرنا چاہیئے۔ سیکھنے کے کئی طریقے ہیں۔ سب سے بلند طریقہ تو وہ ہے جو خضر علیہ السلام کے ساتھ تھا اور جس کو علم لدنی کہتے ہیں۔ وہ تو کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ البتہ دوسرے درجے میں ایک چیز ہے جس کو (Intuition) وجدان کہتے ہیں۔ وہ بھی اگرچہ انتہائی قابل اعتماد ہوتا ہے مگر اس کا حاصل کرنا بھی کسی فنی طریقہ سے ممکن نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد مطالعہ کا نمبر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ذاتی تجربات سے سیکھنا بھی ہے لیکن اپنے ذاتی تجربات سے بھی صرف دانشمند شخص ہی سیکھ سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی غلطیوں سے بھی سیکھنا اور پھر دوسروں کی غلطیوں سے بھی سیکھنا اور یہ نہایت ہی دانشمند لوگوں کا کام ہے۔ اس کے علاوہ اہل ذکر اور اہل علم کی مجالس میں بیٹھنا بھی علم حاصل کرنے کا ایک یقینی اور معتبر ذریعہ ہے اگرچہ اس کے لیئے بھی شوق اور محنت چاہیئے۔ سیکھنے کا ایک طریقہ سننا بھی ہے اور ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض کسی سے اچھی بات سن کر اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس کا ذکر قرآن کریم نے

بھی کیا ہے اور بشارت دی ہے کہ ایسے لوگ ہی ہیں جن کو اللہ پاک نے ہدایت دے رکھی ہے اور وہی دانشمند لوگ ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: فَبَشِّرْ عِبَادِO الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِO (سورۃ الزمر، آیت ۱۷، ۱۸)۔

ترجمہ: میرے بندوں کو خوشخبری سنا دیجیئے۔ جو بات کو کان لگا کر سنتے ہیں پھر جو بہترین بات ہو اس کی اتباع کرتے ہیں۔ یہی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے اور یہی عقلمند بھی ہیں۔

مجھے اللہ پاک نے اپنے لطف وکرم سے ان تمام طریقوں سے گزرنے کی سعادت نصیب فرمائی، جس قدر بھی میرا مقدر تھا۔ سیکھنا تو قبر تک جاری رہنا چاہیئے۔ لیکن علم کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی انسان سیکھنا بند کر دے تو واپسی شروع ہو جاتی ہے جس کا اُس کو احساس بھی نہیں ہو پاتا۔ یعنی سیکھا ہوا بھی بھولنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ کوئی غیر معمولی عمل نہیں تقریباً روزمرّہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اپنے علم میں اتنا اضافہ کرے کہ سرکاری ملازمین اپنے آپ کو حکمران سے بہتر نہ سمجھیں۔ اس میں محکمانہ معلومات کے علاوہ عوامی ضروریات سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیئے اللہ تعالیٰ سے بصیرت مانگتا رہے کیونکہ بصیرت سے مراد دُور کے مستقبل میں دیکھنے کی توفیق ہے۔

۷: اخلاص

اپنے عمل میں اخلاص پیدا کرے۔ اخلاص فی العمل یہ ہے کہ اُس میں کوئی ذاتی غرض نہ ہو نہ ہی دوسرے سے کسی قسم کے بدلے کی توقع رکھے۔ بقول علامہؒ کے:

؎ جس کا عمل ہو بے غرض
اس کی جزا کچھ اور ہے

اخلاص یہ ہے کہ جو کہے وہ وہی ہو جو اُس کے دل میں ہے۔ دشمن بھی اگر مشورہ پوچھے تو اُس کو پوری دیانتداری سے مشورہ دے۔ میں نے یہ وصف چوہدری غلام عباس صاحب مرحوم میں مشاہدہ کیا تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی واضح ہے کہ حکمران کے اپنے اعمال میں کوئی ذاتی غرض نہ ہو۔ اس کا دل جس قدر ذاتی اغراض سے پاک ہو گا اس کے کام میں اتنی ہی برکت ہو گی اور اس کا دل جس قدر اپنی اغراض سے آلودہ ہو گا اس کا کام اسی نسبت سے بے برکت اور فساد کا موجب ہو گا۔

۸: تلاوت

تلاوتِ قرآن و حدیث اور ذکر و اذکار کی مقدار ایک حد سے کم نہ ہونے دے۔ جب وہ کم ہونی شروع ہو تو سمجھ لے کہ کچھ خرابی ہو گئی ہے اس کو دور کرنے کے لیئے روزے رکھنا بہت ہی مفید ہے۔ یوں بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ''اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃ'' اس میں بھی صبر سے مراد روزہ اور صلوٰۃ سے مراد نفل نمازیں ہیں۔ یہی طریقہ ہمارے نبیﷺ کا تھا۔ اگر کبھی آندھی آ جاتی تو فوراً مسجد میں تشریف لے جاتے اور نفل ادا کرتے۔ روزہ تو روز مرّہ کا معمول تھا۔

۹: نماز

نماز وقت کی پابندی کے ساتھ پڑھے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتا رہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتاًo
ترجمہ: بے شک نماز فرض کر دی گئی ہے مومنین پر مقررہ اوقات میں۔ ایک

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَأْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَاo ترجمہ۔ ''اپنے اہل کو نماز کا حکم دیجیئے اور خود بھی اس کی پابندی کی جائے''۔ ایک وقت کی نماز کو دوسرے وقت پر نہ اٹھا رکھے۔ نہ صرف خود نماز کی پابندی کرے بلکہ اپنے متعلقین کو بھی اس کی تاکید کرے۔ اللہ تعالیٰ نے تو حکومت کی جو ذمہ داریاں بتائی ہیں ان میں سرفہرست اقامت صلوٰۃ ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوالصَّلٰوةَ وَاٰتَوُالزَّكٰوةَo ترجمہ: ''وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین پر اقتدار دیں تو وہ نماز کو قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں''۔ اس آیت میں اسلامی حکومت کے بنیادی اہداف اور اغراض بیان کیئے گئے ہیں جنھیں خلافت راشدہ کی اسلامی حکومتوں میں بروئے کار لایا گیا۔ انھوں نے اپنی ترجیحات میں نماز، زکوٰۃ اور امر بالمعروف کو سرفہرست رکھا۔ جب تک مسلمان حکومتیں قرآن کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اقامت صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اہتمام کو سرفہرست نہیں رکھیں گی تب تک وہ فلاحی مملکت کے قیام میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکیں گی۔ میں مرحوم ضیاء الحق کے پاس بیٹھا تھا تو ملٹری سیکرٹری آئے اور انھیں کچھ کہا۔ وہ تو میں نے نہیں سنا لیکن جواب میں جنرل مرحوم نے واضح طور پر کہا کہ اس سے کہو کہ اس وقت بڑے شہنشاہ کے پاس حاضری کا وقت ہے۔

۱۰: یقین

اس بات پر پختہ یقین ہونا چاہیئے کہ حکومت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور وہی جب چاہے لے سکتا ہے۔ ایسے شخص سے اگر حکومت چلی بھی جائے تو اُس کی

عزت میں نہ صرف کمی نہیں آتی بلکہ وہ نسبتاً زیادہ با عزّت ہو جاتا ہے۔ اس بات پر بھی یقین ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ جس کو حکومت عطا کرتے ہیں (اور سب کو وہی حکومت عطا کرتے ہیں) تو پھر اس شخص کی امداد بھی کرتے ہیں۔ اگر وہ امداد طلب کرے تو یہ نُوْرٌ عَلٰی نُوْر کے مصداق ہو جاتا ہے۔ حکمران اگرچہ فاسق و فاجر ہی کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ اس کی بات بھی سنتے ہیں۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

۱۱: حجابات

مال، دولت، اقتدار، زن، زر،شہوت یہ سب حجابات ہیں اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کے مطابق ان میں سب سے بڑا حجاب حکومت اور اقتدار ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حکومت کے کام بہت دلچسپ اور پُر کشش ہوتے ہیں تو لا محالہ دل بھی اسی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ جونہی دل کسی طرف متوجہ ہوا وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے۔ خواہ کوئی اچھی شکل و صورت ہو، دولت ہو یا حکومت۔ حکومت کا کام پوری توجہ اور دیانتداری سے کرے لیکن دل اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع رہے۔

۱۲: زبان

زبان ایک بڑی نعمت بھی ہے اور آفت بھی۔ دین کی سلامتی کے متعلق سب امور زبان سے وابستہ ہیں۔ حکمران کی زبان انتہائی باوقار ہو۔ زبان کی اہمیت، آفت اور افادیت کے بارے میں کچھ واقعات اور تجربات شاید قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں۔ وائسرائے ہند کی کونسل کے کچھ اراکین میں سے ایک رکن کسی دوسرے رکن کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ وہ جب بات کرتا ہے تو اپنا جوتا اپنے

منہ میں ڈال لیتا ہے۔ (اشارہ خراب گفتگو کی طرف ہے)۔ میں نے ایک دفعہ غازیٔ ملّت سردار محمد ابراہیم خان (مرحوم) سے اپنے ایک دیرینہ ساتھی کے متعلق سفارش کی تو کہنے لگے کہ اُس سے کہیں کہ میں اُس کی مدد کروں گا بشرطیکہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔ میں نے بھی اس ساتھی کو کئی مرتبہ یہی بات کہی کہ اگر کوئی آپ کو بیس باتیں کہتا ہے تو آپ ایک بات کا جواب دیا کریں۔ فارسی زبان کا ایک محاورہ ہے:

؎ زباں ہم گنجِ بے پایاں بود
زباں ہم رنجِ بے درماں بود

''زبان ہی لامحدود خزانہ ہے اور زبان ہی لا علاج بیماری ہے''۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تعالیٰ کا قول بھی زبان کے بارے میں معروف ہے کہ ''تلوار کا گھاؤ بھر جاتا ہے لیکن زبان کا گھاؤ نہیں بھرتا''۔ کسی دانا کا قول ہے: زباں شیریں ملک گیری۔ قرآن پاک میں ایمان والوں کی صفات کے بارے میں فرمایا: وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ o ترجمہ: ''اور وہ لغو بات سے منہ پھیر لیتے ہیں''۔ یہاں لغو بات سے مراد زبان سے نکلی ہوئی غیر ضروری بات ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَھْوَ الْحَدِیْثِ o ترجمہ: ''اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو لغو باتوں کو مول لیتے ہیں''۔ اس ضمن میں ایک طویل حدیث مبارک ہے جس کے راوی حضرت معاذؓ ہیں فرماتے ہیں: عَنْ مَعَاذٍ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اَخْبِرْنِیْ بِعَمَلٍ یُدْخِلُنِی الْجَنَّۃَ وَیُبَاعِدُنِیْ مِنَ النَّارِ قَالَ لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ اَمْرٍ عَظِیْمٍ وَاِنَّہٗ لَیَسِیْرٌ عَلٰی مَنْ یَّسَّرَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ تَعْبُدُ اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا وَتُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ وَتُؤْتِی الزَّکٰوۃَ وَتَصُوْمُ

رَمَضَانَ وَتَحُجُّ الْبَيْتَ، ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى اَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ، وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِى الْمَاءُ النَّارَ وَصَلٰوةُ الرَّجُلِ فِىْ جَوْفِ اللَّيْلِ۔ ثُمَّ تَلَا تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَّطَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ حَتّٰى بَلَغَ يَعْمَلُوْنَ ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّكَ بِرَأْسِ الْاَ مْرِ وَ عُمُوْدِهٖ اَلصَّلٰوةُ ذُرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ قُلْتُ بَلٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ رَأْسُ الْاَ مْرِالْاِ سْلَامُ وَعُمُوْدُهٗ الصَّلٰوةُ وَذُرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ۔ ثُمَّ قَالَ اَلَا اُخْبِرُكَ بِمِلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهٖ قُلْتُ بَلٰى يَا نَبِىَّ اللّٰهِ فَاَخَذَ بِلِسَانِهٖ فَقَالَ كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا فَقُلْتُ يَا نَبِىَّ اللّٰهِ وَاِنَّالَمُؤَّاخَذُوْنَ بِمَانَتَكَلَّمُ بِهٖ قَالَ ثَكَلَتْكَ اُمُّكَ يَامَعَاذُ وَهَلَ يَكُبُّ النَّاسَ فِى النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اَوْعَلٰى مَنَاخِرِهِمْ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ۝ (احمد و ترمذی و ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ میں نے ایک دن رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ: حضرت! مجھے ایسا عمل بتا دیجیئے جس کی وجہ سے میں جنت میں پہنچ جاؤں اور دوزخ سے دور کر دیا جاؤں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے بہت بڑی بات پوچھی ہے، لیکن (بڑی اور بھاری ہونے کے باوجود) وہ اس بندے کے لیئے آسان ہے جس کے لیئے اللہ تعالیٰ اس کو آسان کر دے (اور توفیق دے دے) لو سنو! (سب سے مقدم بات تو یہ ہے کہ دین کے ان بنیادی مطالبوں کو فکر اور اہتمام سے ادا کرو) اللہ کی عبادت کرو،اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور اچھے طریقے سے (اور دل کی توجہ کے ساتھ) نماز ادا کیا کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور رمضان کے روزے رکھا کرو اور بیت اللہ کا حج کرو۔ پھر فرمایا: کیا میں تمہیں خیر کے دروازے بھی بتا دوں؟ (گویا جو کچھ اب تک آپ ﷺ نے بتلایا یہ تواسلام کے ارکان اور فرائض تھے، اس کے

بعد آپ نے فرمایا، کہ تم چاہو تو میں تمہیں خیر کے اور دروازے بتلاؤں (غالبًا اس سے آپ کی مراد نفل عبادات تھیں، چنانچہ حضرت معاذ کی طلب دیکھ کر) آپﷺ نے اُن سے فرمایا روزہ (گناہوں سے اور دوزخ کی آگ سے بچانے والی) سپر اور ڈھال ہے اور صدقہ گناہ کو (اور گناہ سے پیدا ہونے والی آگ کو) اس طرح بجھا دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اور رات کے درمیانی حصے کی نماز (یعنی نمازِ تہجد کا بھی یہی حال ہے اورابواب خیر میں اس کا خاص الخاص مقام ہے) اس کے بعد آپ نے تہجد اور صدقہ کی فضیلت کے سلسلہ میں) سورۂ سجدہ کی آیت پڑھی۔ پھر آپ نے فرمایا: کیا میں تمہیں معاملہ کا (یعنی دین کا) راز اور اس کا عمود یعنی ستون اور اس کی بلند چوٹی بتا دوں؟ (معاذؓ کہتے ہیں) میں نے عرض کیا: حضرت ضرور بتا دیں! آپﷺ نے فرمایا: دین کا راز یا سِرا اسلام ہے اور اس کا ستون نماز ہے اور اس کی بلند چوٹی جہاد ہے۔ پھر آپﷺ نے فرمایا:

کیا میں تمہیں وہ چیز بھی بتا دوں جس پر گویا ان سب کا مدار ہے (اور جس کے بغیر یہ سب چیزیں ہیچ اور بے وزن ہیں، معاذ کہتے ہیں) میں نے عرض کیا حضرت وہ چیز بھی ضرور بتلا دیجیئے! پس آپﷺ نے اپنی زبان پکڑی اور فرمایا: اس کو روکو (یعنی اپنی زبان قابو میں رکھو، یہ چلنے میں بیباک اور بے احتیاط نہ ہو، معاذ کہتے ہیں) میں نے عرض کیا: حضرت! ہم جو باتیں کرتے ہیں، کیا ان پر بھی ہم سے مواخذہ ہو گا؟ آپ نے فرمایا: اے معاذ! تجھے تیری ماں روئے (عربی محاورہ کے مطابق یہاں یہ پیار کا کلمہ ہے) آدمیوں کو دوزخ میں ان کے منہ کے بل، یا فرمایا کہ ان کی ناکوں کے بل (زیادہ تر) ان کی زبانوں کی بیباکانہ باتیں

ہی ڈلوائیں گی''۔

حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ دین کے دس حصوں میں سے نو حصے زبان کے ساتھ وابستہ ہیں۔

اسی نوعیت کی دو اور احادیث مبارک درج ذیل ہیں:

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رَفَعَهٗ قَالَ اِذَا اَصْبَحَ ابْنُ اٰدَمَ فَاِنَّ الْاَعْضَاءَ کُلَّهَا تُکَفِّرُ اللِّسَانَ فَتَقُوْلُ اِتَّقِ اللّٰهَ فِیْنَا فَاِنَّا نَحْنُ بِکَ فَاِنِ اسْتَقَمْتَ اِسْتَقَمْنَا وَاِنِ اعْوَجَجْتَ اِعْوَجَجْنَاo (ترمذی)

ترجمہ: ''حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے اور رسول اللہﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب آدمی صبح کرتا ہے تو اس کے سارے اعضاء عاجزی اور لجاجت (مِنت) کے ساتھ زبان سے کہتے ہیں کہ (اللہ کی بندی ہم پر رحم کر اور) ہمارے بارے میں اللہ سے ڈر کیونکہ ہم تیرے ہی ساتھ بندھے ہوئے ہیں، تو ٹھیک رہی تو ہم بھی ٹھیک رہیں گے اور اگر تو نے غلط روی اختیار کی، تو ہم بھی غلط روی کریں گے (اور پھر اس کا خمیازہ بھگتیں گے)''۔ اوپر والی حدیث سے معلوم ہوا تھا کہ انسان کے ظاہری اعضاء میں سے زیادہ تر زبان ہی کی غلط روی لوگوں کے جہنم میں ڈالے جانے کا باعث ہو گی۔ اس حدیث میں بتلایا گیاہے کہ زبان کی اسی خاص نوعیت کی وجہ سے ہر روز انسان کے سارے اعضاء بزبانِ حال یا بزبانِ قال پوری عاجزی اور لجاجت کے ساتھ زبان سے درخواست کرتے ہیں کہ اللہ کی بندی ہماری صلاح و فلاح اور ہمارے انجام کی اچھائی برائی تجھ سے

ہی وابستہ ہے اس لیئے ہم پر رحم کر اور اللہ سے بے خوف ہو کر بیباکانہ نہ چل ورنہ تیرے ساتھ ہم بھی اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ يَضْمَنْ لِيْ مَابَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَابَيْنَ رِجْلَيهِ اَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَo (بخاری)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص ذمہ لے لے جو کچھ اس کے دو جبڑوں کے درمیان ہے (یعنی زبان کا) اور جو کچھ اس کی دو ٹانگوں کے درمیان ہے (یعنی شرمگاہ کا) (کہ یہ دونوں غلط استعمال نہ ہوں گی) میں اُس کے لیئے جنت کی ذمہ داری لیتا ہوں''۔ اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے'' يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْن '' ترجمہ: اے ایمان والو ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر تم عمل نہیں کرتے'' اسی آیت مبارکہ کے تسلسل میں فرمایا کہ یہ سب سے بڑا گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا موجب ہے۔ پھر ایک عمومی حکم کے تحت ارشاد فرمایا ''وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا '' ترجمہ: ''اور تمام لوگوں کے لیئے اچھی بات کہو''۔ اسی طرح زبان ہی کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ''فَلْيَقُلْ خَيْراً اَوْلِيَسْكُتْ '' (الحدیث) ترجمہ: ''پس چاہیئے کہ اچھی بات کی جائے ورنہ خاموشی بہتر ہے''۔ اور اسی طرح آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی زبان ہی کے متعلق ہے فرمایا: سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَ قِتَالُهٗ كُفْراً (الحدیث) ترجمہ: ''مسلمان کو گالی دینا فسق اور اُس کو قتل کرنا کفر ہے''۔ پھر ارشاد فرمایا: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِن اللِّسَانِهٖ وَ يَدِهٖ (الحدیث) ترجمہ: ''مسلمان ہے ہی وہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ

رہیں''۔ قرآن و حدیث کے مذکورہ بالا ارشادات کی روشنی میں معلوم ہوا کہ صرف زبان پر قابو پانے سے ہی اسلام کی اصل روح تک رسائی ممکن ہوسکتی ہے اور ساتھ ہی تاکیداً حکم ہوا کہ دوسرے مسلمانوں کو اپنی زبان اور ہاتھ کے شر سے محفوظ رکھنے میں ہی انسان کامل مومن اور مسلمان کہلانے کے لائق ہو سکتا ہے۔ علاّمہ اقبالؒ کے یہ اشعار لیڈر، رہنما، یا حکمران کو درکار خوبیوں اور اوصاف کی بہترین عکاسی کرتے ہیں:

؎ نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیئے

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ میرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

پھر علامہؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

؎ نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو

حکمران ہو یا فرد دونوں کی گفتگو میں یہ خوبی ہونی چاہیئے۔ اس بارے میں اسی مضمون میں کافی لکھا گیا ہے۔ گفتگو کی اہمیت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''بہتر کلام وہ ہے جو مختصر ہو اور دلیل پر مبنی ہو''۔ دوسری جگہ فرمایا ''لوگوں کے ساتھ ان کی عقل کے اندازے کے مطابق بات کرو''۔ جس طرح طویل گفتگو کے کئی نقائص ہیں اسی طرح مختصر کلام کے بے شمار فوائد ہیں۔ دنیا کے اکثر بڑے لوگ مختصر گفتگو کرنے والے ہوئے ہیں۔ مجھے کئی بڑے لوگوں کی تقاریر پڑھنے کا شوق تھا۔ اکثر و بیشتر حضرات نہایت مختصر بات کرنے والے تھے۔ خود قائداعظمؒ بہت مختصر بات کرتے تھے۔ ان کی کئی تقاریر محض چند جملوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔

برِّصغیر میں سب سے لمبی، نہایت جاذب اور مؤثر تقریر کرنے والے حضرت مولانا عطا اللہ شاہ بخاری تھے مگر وہ ناراضگی سے کہتے تھے کہ یہ ایسے تیسے لوگ تقریر میری سنتے ہیں اور ووٹ مسلم لیگ کو دیتے ہیں۔ ایک معروف انگریز قانون دان کا قول ہے ''زیادہ گفتگو کرنے والا جج ساز میں بے ربط تار ہوتا ہے''۔ یہ بات ہر مقرر پر صادق آتی ہے۔ رسول اللہﷺ کے بارے میں یہ بات اُن کے خواص میں سے تھی کہ اُن کو ''جوامع الکلام'' کہا جاتا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ بات مختصر ہوتی تھی مگر وہ اپنے اندر بے شمار معنی و مفہوم رکھتی تھی۔

۱۳: نفس

نفس کی سرکوبی کے لیئے یہ بات بہت اکسیر ہے کہ جس بات کو نفس سننا پسند نہ کرے اسی کو سنا جائے اور نفس کا کہا نہ مانا جائے۔اس ضمن میں حضرت علیؓ کا معروف واقعہ ہے کہ حضرت علیؓ نے خیبر کے میدان میں یہودیوں کے نامور کمانڈر مرحب کو پہلے ہی مرحلے پر دونوں شانے چت گرادیا تو وہ چونکہ آپ کا مزاج شناس تھا اس نے حضرت علیؓ کے چہرے پر تھوک دیا حضرت علیؓ نے فوراً اس کو چھوڑ دیا باقی ساتھیوں پر اس کا برا اثر پڑا۔ آپؓ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جب میں نے اس کو گرایا تو میرے سامنے اللہ اور رسولﷺ اور دین اسلام تھے لیکن جب اس نے میرے چہرے پر تھوکا تو میرے نفس نے فوراً سرکشی کی اور میرے سامنے اپنی انانیت کا نقشہ ابھرا اور اللہ اور رسولﷺ پردے میں چلے گئے۔ میں نے نفس کی اصلاح کے لیئے فوراً مرحب کو چھوڑ دیا تاکہ میرے نفس کو اس سے اذیت پہنچے۔ اسی کو قرآن نے کہا: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىo فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰىo

ترجمہ: ''اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کی خواہش کو روکا اس کا ٹھکانا جنت ہے''۔ نفس کی خرابی کے بارے میں فرمانِ خداوندی ہے ''اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ '' ترجمہ: ''نفس تو بے شک برائی کا ہی حکم دیتا ہے سوائے اس کے جس پر اللہ رحم فرمائے''۔

۱۴: غصہ

اس ضمن میں ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ اگر غصہ آئے جو روز مرّہ کی بات ہے تو کوشش کرے کہ اپنے سے کمزور پر نہ آئے۔ بلکہ غصہ ناگزیر ہو تو اپنے سے طاقتور پر آزمائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو پیشِ نظر رکھے وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ ترجمہ: ''اور غصہ کو پی جانے والوں اور لوگوں کو معاف کرنے والوں اور احسان کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے''۔ اسی تسلسل میں ایک واقعہ کا تذکرہ بھی برمحل ہو گا جو تاریخی کتب میں مذکور ہے حضرت حسنؓ (نواسۂ رسول ﷺ) جو انتہائی خوش پوشاک اور خوش خوراک تھے، ایک مرتبہ اُن کی خادمہ نے اُن کو کھانا پیش کیا تو اچانک اُس کے ہاتھ سے سالن کا برتن آپؓ کے کپڑوں پر گر پڑا اور آپؓ کا سارا لباس سالن آلود ہو گیا۔ خادمہ خوفزدہ ہو گئی اور ایسے موقعہ پر کسی بھی خادم کا خوفزدہ ہونا فطری بات ہے۔ اُس نے قرآن کی یہ آیت پڑھی (وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ) اور غصہ کو پی جانے والے۔ یہ آیت مبارکہ سُن کر آپؓ نے انتقام کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر اُس نے آیت کا دوسرا حصہ پڑھا: (وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ) اور لوگوں کو معاف کرنے والے۔ آپؓ نے فرمایا میں نے تم کو معاف کر دیا۔ اُس نے پھر آیت کا تیسرا حصہ پڑھا: (وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ) اور اللہ تعالیٰ

احسان کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں۔ جواباً آپؓ نے فرمایا کہ جاؤ تم آزاد ہو۔ اسی طرح ایک اور حدیث شریف جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلاً شَتَمَ اَبَابَکْرٍ وَالنَّبِیُّ ﷺ جَالِسٌ یَتَعَجَّبُ وَیَتَبَسَّمُ فَلَمَّا اَکْثَرَ رَدَّ عَلَیْهِ بَعْضَ قَوْلِهٖ فَغَضِبَ النَّبِیُّ ﷺ وَقَامَ فَلَحِقَهٗ اَبُوْبَکْرٍ وَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ کَانَ یَشْتِمُنِیْ وَاَنْتَ جَالِسٌ فَلَمَّا رَدَدْتُّ عَلَیْهِ بَعْضَ قَوْلِهٖ غَضِبْتَ وَقُمْتَ قَالَ کَانَ مَعَکَ مَلَکٌ یَرُدُّ عَلَیْهِ فَلَمَّا رَدَدْتَّ عَلَیْهِ وَقَعَ الشَّیْطَانُ ثُمَّ قَالَ یَا اَبَا بَکْرٍ ثَلٰثٌ کُلُّهُنَّ حَقٌّ مَا مِنْ عَبْدٍ ظُلِمَ بِمَظْلِمَةٍ فَیُغْضِیْ عَنْهَا لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اِلَّا اَعَزَّ اللّٰهُ بِهَا نَصْرَهٗ وَ مَا فَتَحَ رَجُلٌ بَابُ عَطِیَّةٍ یُرِیْدُ بِهَا صِلَةً اِلَّا زَادَ اللّٰهُ بِهَا کَثْرَةً وَمَافَتَحَ رَجُلٌ بَابَ مَسْئَلَةٍ یُرِیْدُبِهَا کَثْرَةً اِلَّا زَادَ اللّٰهُ بِهَا قِلَّةًo (احمد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ابوبکرؓ کو گالیاں دیں اور رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے، (اور آپ اس شخص کے مسلسل گالیاں دینے پر اور ابوبکرؓ کے صبر کرنے اور خاموش رہنے پر) تعجب اور تبسم فرما رہے تھے، پھر جب اس آدمی نے بہت ہی زیادہ گالیاں دیں (اور زبان کو روکا ہی نہیں) تو ابو بکرؓ نے بھی اس کی بعض باتوں کو اس پر الٹ دیا اور کچھ جواب دیا، پس رسول اللہ ﷺ کچھ ناراضگی کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر چل دیئے (حضرت ابوبکرؓ کو اس سے بہت فکر لاحق ہوئی اور وہ بھی معذرت کے لیئے اور حضور ﷺ کی ناراضگی کا سبب معلوم کرنے کے لیئے آپ ﷺ کے پیچھے چلے) پس ابو بکرؓ آپ ﷺ کے پاس پہنچے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! یہ کیا بات ہوئی کہ وہ شخص مجھے گالیاں دیتا رہا اور آپ وہاں تشریف فرما رہے، پھر جب میں نے کچھ جواب دیا، تو حضور ناراض ہوکر اٹھ آئے؟ آپ ﷺ نے ارشاد

فرمایا: جب تک تم خاموش تھے اور صبر کر رہے تھے، تمہارے ساتھ اللہ کا ایک فرشتہ تھا، جو تمہاری طرف سے جوابدہی کر رہا تھا، پھر جب تم نے خود جواب دیا، تو (وہ فرشتہ تو چلا گیا اور) شیطان بیچ میں آ گیا (کیونکہ اسے امید ہو گئی کہ وہ لڑائی کو اور آگے بڑھا سکے گا) اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابو بکرؓ! تین باتیں ہیں جو سب کی سب بالکل حق ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ جس بندہ پر کوئی ظلم و زیادتی کی جائے اور وہ محض اللہ عزو جل کے لیئے اس سے درگزر کرے (اور انتقام نہ لے)، تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں اس کی بھرپور مدد فرمائیں گے (دنیا اور آخرت میں اس کو عزت دیں گے) اور دوسری بات یہ ہے کہ جو شخص صلہ رحمی کے لیئے دوسروں کو دینے کا دروازہ کھولے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے عوض اس کو اور بہت زیادہ دیں گے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ جو آدمی (ضرورت سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ) اپنی دولت بڑھانے کے لیئے سوال اور گداگری کا دروازہ کھولے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی دولت کو اور زیادہ کم کر دیں گے۔

۱۵: تکبر

انسان میں ایک بڑی سنگین بیماری تکبر ہے۔ تکبر کی وجہ سے فرشتوں کا سردار (ابلیس) لعنتی ہو گیا تھا۔ تکبر سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے مدد بھی لگاتار طلب کرتا رہے۔ کیونکہ محض یہ پتا لگانا بھی ممکن نہیں ہے کہ تکبر انسان کے کس کس گوشہ میں چھپا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو اپنے سے بہتر سمجھے۔ اگر بہتر نہیں سمجھ سکتا تو کم از کم اپنے جیسا ہی سمجھے۔ اگر ان کو اپنے سے کمتر تصور کرے گا تو یہ تکبّر ہو گا اور متکبّر کے بارے میں رسول ﷺ کا ارشاد ہے

فرمایا: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِہٖ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِنْ کِبْرٍ ۝ ترجمہ: ''جس شخص کے دل میں ایک رائی کے دانے برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں ہر گز داخل نہ ہو گا''۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ'' جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا''۔لیکن یہ اندازہ لگانا کہ میرے دل میں تکبر ہے کہ نہیں اور میرے کس عمل میں تکبر ہے نہایت ہی مشکل کام ہے۔ علامات سے واضح ہوتا ہے کہ کن باتوں پر عمل کرنے سے آدمی تکبّر سے بچ سکتا ہے۔ مثلاً ایک مسلمان معمول بنا لے کہ شلوار کو ٹخنوں سے اوپر رکھے۔ ہمارے ہاں لوگ اس کو نماز کا حکم سمجھتے ہیں حالانکہ آپﷺ کا یہ ارشاد کہ ''شلوار کو ہمیشہ ٹخنوں سے اوپر رکھو، کپڑوں کو زمین پر نہ گھسیٹو کہ یہ تکبّر کی علامات میں سے ہے اور تکبّر اللہ تعالیٰ کو سخت نا پسند ہے'' واضح حکم ہے کہ شلوار کو عام حالت میں بھی ٹخنوں سے اوپر رکھنا چاہیئے۔ اور نماز میں یہ حکم اور بھی تاکیدی ہے۔ اسی طرح اپنا بچا ہوا کھانا پلیٹ میں بکھیر کر نہ چھوڑے اور اگر کھانا ضرورت سے زائد ہو تو اس کو باادب طریقے سے برتن کے درمیان میں اکٹھا کر دے۔ برتن اور انگلیاں بھی چاٹ لے۔ چونکہ یہ رسولﷺ کی مستقل سنت ہے۔ اگر دل میں نفرت کا احساس ہو تو حضرت حذیفہؓ کا عمل یاد کرے جو رومیوں کی دعوت پر تشریف لے گئے۔ وہاں کھانے کے دوران اُن کے ہاتھ سے نوالہ گر گیا تو انھوں نے فوراً اٹھا کر جھاڑا اور بلا تکلّف کھا لیا۔ ساتھیوں میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ یہ بات اتنی بڑی محفل کے آداب کے خلاف ہے۔ آپؓ نے اُن کی طرف اشارہ کر کے ایک معروف تاریخی جملہ کہا کہ: أ اَتْرُکُ سُنَّۃِ حَبِیْبِیْ لِھٰٓؤُلَاءِ الْحُمَقَآء ترجمہ: ''کیا میں ان احمقوں کی خاطر اپنے حبیبﷺ کی سنت کو ترک کر دوں''۔ اس جملہ سے ایک تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صحابہؓ کے ارادے اور عمل میں سنت کی

کس قدر اہمیت تھی جس کا برملا وہ اظہار بھی کرتے تھے۔ وہ کسی بھی تہذیب سے مرعوب نہ تھے۔ آج ہم ہیں جو مغرب کے تشخص سے متاثر ہو کر اسلام کے بنیادی اصولوں اور اقدار کو پامال کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی پیش نظر رہے کہ: عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ ثَلٰثَۃٌ لَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ قَالَ اَبُوْ ذَرٍّ خَابُوْا وَخَسِرُوْا مَنْ ھُمْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ الْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ وَالْمُنْفِقُ سِلْعَتَہٗ بِالْحَلْفِ الْکَاذِبِ o (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ اُن سے ہم کلام ہو گا، نہ اُن پر عنایت کی نظر کرے گا اور نہ گناہوں اور گندگیوں سے اُن کو پاک کرے گا اور اُن کے لیئے دردناک عذاب ہے۔ ابو ذر غفاریؓ نے عرض کیا۔ یہ لوگ تو نامراد ہوئے اور ٹوٹے میں پڑے، حضورؐ! یہ تین کون کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنا تہبند حد سے نیچے لٹکانے والا (جیسا کہ متکبروں اور مغروروں کا طریقہ ہے) اور احسان جتانے والا اور جھوٹی قسمیں کھا کے اپنا سودا چلانے والا۔

۱۶: تجسّس

اگرچہ سب کے لیئے ضروری ہے مگر خاص کر حکمران کے لیئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے عیبوں کی ٹوہ لگانے کی بجائے اُن کی خوبیوں کو ڈھونڈے اور اپنے عیب تلاش کرے۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ بلا استثنیٰ اچھا سلوک کرے خواہ وہ کسی بھی طبقے یا گروہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ ذاتی معاملات میں لوگوں سے انتقام نہ لے

بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کے: وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ ''اور جس نے صبر کیا اور معاف کیا''۔ حکمران معاشرہ و سماج کو ان ناانصافیوں سے پاک کرے بلکہ اس کا حتی الوسع تدارک بھی کرے۔ اچھی حکمرانی اچھی حکومت اور اچھے حکمرانوں کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔اچھی حکمرانی وہ ہو گی جس کا حکمران اچھا ہو گا۔ اچھی حکومت یا حکمرانی کا تقاضا ہے کہ اس علاقہ کے عام و خاص لوگوں کے اجتماعی حالات سے لے کر شخصی ضروریات تک کے حالات کے بارے میں حتی الامکان معلومات ہوں اور اس کے مطابق ان ذمہ داریوں کو نبھانے کی کوشش کی جائے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس ملک میں ادارے بھی حکمران کے پروگرام پر عمل کریں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عام و خاص لوگوں کے حالات سے پوری طرح آگاہی ہو۔ ماضی میں کئی ممالک میں مسلم و غیر مسلم متعدد حکمران ایسے ہوئے ہیں کہ وہ اسی طریقہ پر عمل کرتے تھے ۔ البتہ رسولﷺ کا ایک اور عمل ہے کہ ''اعمالکم عمالکم'' ''تمہارے اعمال تمہارے حکم ہیں''۔ معلومات حاصل کرنے کے بھی کئی طریقے ہیں۔ ایک معروف طریقہ تو خفیہ ایجنسیاں ہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی اطلاعات بھی ناقابل یقین ہوتی جا رہی ہیں۔ اس لیئے اس کا کوئی قابل اعتماد متبادل دریافت کرنا چاہیئے جو ناممکن نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکمران صرف متعلقہ سرکاری اداروں کی رپورٹوں کو ہی مکمل معلومات سمجھے بلکہ براہِ راست لوگوں کے مسائل اور مصائب سے باخبر رہنے کی کوشش کرے اور تمام حالات پر خود نظر رکھے۔ اس کے لئے ایسا نظام وضع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعہ اس کو صحیح خبر ملتی رہے۔ سرکاری ایجنٹوں کی محتاجی نہ ہو۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ حکومت اللہ و رسول کی طرف سے اور عوام کی طرف سے ایک امانت ہے۔ قرن اول میں اس حکومتی ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم تھا

کہ خلیفۂ اوّل جن کا جسم مبارک بھاری تھا چھ ماہ کی حکومت میں ہی ان کا جسم مبارک پتلا ہو گیا تھا۔ اللہ ہم سب کو اس احساس کا کچھ حصہ عطا کردیں تاکہ قیامت کی جوابدہی سے بچا جا سکے۔ نیز حکمران کو یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیئے کہ وہ بھی اُسی معاشرے میں رہ رہا ہے اور اسی کا ایک فرد ہے۔ رہن سہن اور طرز زندگی میں جتنی یکسانیت ہو گی اتنا ہی حکمران کا عوام کے ساتھ قرب ہو گا۔ لہذا معاشرتی مسائل و مشکلات اور اُن کا حل ہمیشہ حکمران کے ذہن و قلب میں رہنا چاہیئے۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ ''ہر شخص ایک حاکم ہے اور اُس کی رعایا کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا'' رعایا کے حقوق کی جوابدہی اتنی سخت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ''اگر دریائے دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو اُس کی ذمہ داری عمر پر ہو گی''۔

۱۷: نرمی و سختی

حکمران کا نرم خو ہونا بے حد ضروری ہے تاہم اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرے اور نرمی و سختی اگر اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متّصف ہو تو سونے پر سہاگہ ہے۔ جیسے حدیث شریف میں ارشاد فرمایا: تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ۔ ''تم اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے مزیّن کرو'' حکمران کو نظم و ضبط اور حقوق کے معاملہ میں سختی کرنی چاہیئے کیونکہ فیصلہ نافذ کرنے اور نظم و ضبط کے معاملہ میں بے جا نرمی حکومت کو غیر مؤثر بناتی ہے۔ حضرت ابو ھریرہؓ سے روایت کردہ ایک حدیث مبارک ہے کہ: عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِمَنْ یحْرُمُ عَلَی النَّارِ وَبِمَنْ تَحْرُمُ النَّارُ عَلَیْہِ عَلٰی کُلِّ ھَیِّنٍ لَیِّنٍ قَرِیْبٍ سَھْلٍ o
(ابوداؤد و الترمذی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تم کو ایسے شخص کی خبر نہ دوں جو دوزخ کے لیئے حرام ہے اور دوزخ کی آگ اس پر حرام ہے؟ (سنو میں بتاتا ہوں، دوزخ کی آگ حرام ہے) ہر ایسے شخص پر جو مزاج کا تیز نہ ہو، نرم ہو، لوگوں سے قریب ہونے والا ہو، نرم خو ہو۔ اس حدیث میں ھَیِّن''، لَیِّن'' ، قَرِیْبُ'، سَھْلُ' یہ چاروں لفظ قریب المعنی ہیں اور نرم مزاجی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جو آدمی اپنے مزاج اور رویہ میں نرم ہو اور اپنی نرم خوئی کی وجہ سے لوگوں سے خوب ملتا جلتا ہو، دُور دُور اور الگ الگ نہ رہتا ہو اور لوگ بھی اس کی اس اچھی اور شیریں خصلت کی وجہ سے اُس سے بے تکلف اور محبت سے ملتے ہوں، جس سے بھی بات اور معاملہ کرتا ہو، نرمی اور مہربانی سے کرتا ہو، ایسا شخص جنتی ہے اور دوزخ کی آگ اس پر حرام ہے۔

۱۸: صلہ رحمی

فقیہ ابو اللّیث ثمرقندیؒ فرماتے ہیں کہ صلہ رحمی میں دس چیزیں پسندیدہ پائی جاتی ہیں:

۱: اس میں اللہ کی رضا مندی ہے کیوں کہ یہ اسی کا دیا ہوا حکم ہے۔

۲: قرابت والوں کو مسرت ہو گی اور حدیث شریف میں ہے کہ بہترین عمل اہلِ ایمان کو خوش کرنا ہے۔

۳: اس سے فرشتے خوش ہوتے ہیں۔

۴: اس میں مسلمانوں کی طرف سے اسے تحسین و تعریف حاصل ہو گی۔

۵: اس سے ابلیس ملعون غمگین ہوتا ہے۔

۶: اس سے عمر میں زیادتی ہوتی ہے۔

۷: رزق میں برکت ہوتی ہے۔

۸: مرنے والے آباء و اجداد صلہ رحمی سے خوش ہوتے ہیں۔

۹: باہمی میل جول سے محبت بڑھتی ہے کیوں کہ ایک دوسرے کی شادی غمی میں شریک ہونے اور تعاون کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔

۱۰: مر جانے کے بعد اجر بڑھتا رہتا ہے اس لیئے کہ رشتہ دار جب اس کے احسانات اور حسن سلوک کو یاد کریں گے تو اس کو دعائیں دیں گے۔

صلہ رحمی سے متعلق احادیث مبارکہ

۱: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ یَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ اِنَّ لِیْ قَرَابَةً اَصِلُهُمْ وَیَقْطَعُوْنِیْ وَاُحْسِنُ اِلَیْهِمْ وَیُسِیْئُوْنَ اِلَیَّ وَاَحْلَمُ عَنْهُمْ وَیَجْهَلُوْنَ عَلَیَّ فَقَالَ لَئِنَ کُنْتَ کَمَا قُلْتَ فَکَاَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ وَلاَ یَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللّٰهِ ظَهِیْرٌ عَلَیْهِمْ مَّادُمْتَ عَلٰی ذٰلِكَ۔

ترجمہ: ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا میرے رشتہ دار ہیں میں ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں وہ قطع رحمی کرتے ہیں، میں ان پر احسان کرتا ہوں وہ میرے ساتھ بُرا سلوک کرتے ہیں، میں ان سے درگزر کرتا ہوں وہ مجھ پر جہالت کرتے ہیں فرمایا جس طرح تو کہتا ہے اگر واقعتاً ایسا ہی ہے گویا تو ان کو گرم راکھ کھلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرے ساتھ ایک مددگار رہتا ہے جب تک تو اس پر قائم رہے۔

۲: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ تَعَلَّمُوْا مِنْ اَنْسَابِكُمْ

مَّاتَصِلُوْنَ بِہٖ اَرْحَامَکُمْ فَاِنَّ صِلَۃَ الرَّحِمِ مَحَبَّۃ'' فِی الْاَھْلِ مَثْرَاۃ'' فِی الْمَالِ مَنْسَاَۃ'' فِی الْاَثَرِ۔

ترجمہ: ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا اپنے نسب سیکھو تاکہ صلہ رحمی کر سکو اقارب میں صلہ رحمی کرنا، اقربا میں محبت مال میں کثرت اور موت میں تاخیر کا باعث ہے۔

۳: عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو وَعَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ لَیْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُکَافِیُ وَلٰکِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِیْ اِذَا انْقُطِعَتْ رَحِمُہٗ وَصَلَھَا۔

ترجمہ: روایت ہے عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ آنحضرتﷺ نے فرمایا صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں کہ نیکی کے بدلہ میں نیکی کرے بلکہ جب اُس کے ساتھ رشتہ توڑا جائے تو وہ اُس کو جوڑے۔

۴: عَنْ حُذَیْفَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ لَا تَکُوْنُوْا اِمَّعَۃً تَقُوْلُوْنَ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّاوَاِنْ ظَلَمُوْا ظَلَمْنَا وَلٰکِنْ وَطِّنُوْا اَنْفُسَکُمْ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّا وَاَنْ تُحْسِنُوْا وَ اِنْ اَسَاءُ وْا فَلَاتَظْلِمُوْا۔

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: تم دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرنے والے نہ بنو،کہ کہنے لگو کہ اگر اور لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر دوسرے لوگ ظلم کا رویہ اختیار کریں گے تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے، بلکہ اپنے دلوں کو اس پر پکا کرو کہ اگر اور لوگ احسان کریں تب بھی تم احسان کرو اور اگر لوگ برا سلوک کریں تب بھی تم ظلم اور برائی کا رویہ اختیار نہ کرو (بلکہ احسان ہی کرو)۔

۴: وَعَنْ اَسْمَآءَ بِنْتِ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَتْ قَدِمَتْ عَلَیَّ اُمِّیْ وَھِیَ مُشْرِکَۃٌ فِیْ عَھْدِ قُرَیْشٍ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ اُمِّیْ قَدِمَتْ عَلَیَّ وَھِیَ رَاغِبَۃٌ اَفَاَ صِلُھَا قَالَ نَعَمْ صِلُھَا۔

ترجمہ: اسمؓ بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہا قریش کے ساتھ صلح کے زمانہ میں میری ماں میرے پاس آئی وہ اس وقت تک مشرکہ تھی میں نے کہا اے اللہ کے رسولؐ میری ماں میرے پاس آتی ہے اور اسلام سے بیزار ہے کیا میں اس سے حسنِ سلوک سے پیش آؤں فرمایا ہاں تو اس سے حسن سلوک کر۔

۶: عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ الرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُھُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ الرَّحِمُ شَجْنَۃٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ فَمَنْ وَ صَلَھَا وَصَلَہُ اللّٰہُ وَمَنْ قَطَعَہٗ قَطَعَہُ اللّٰہُ۔

ترجمہ: روایت ہے عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ فرمایا حضورﷺ نے رحمٰن رحم کرنے والوں پر رحم کرتا ہے، تم رحم کرو زمین والوں پر آسمان والا تم پر رحم کرے گا (یعنی اللہ تعالیٰ جو اوپر ہے) رحم شاخ ہے رحمٰن کی جس نے اس کو ملایا اللہ تعالیٰ اس کو ملا دے گا اور جس نے اسے توڑا اللہ اسے توڑ دے گا۔

۷: عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنْ اَحَبَّ اَنْ یَّصِلَ اَبَاہُ فِیْ قَبْرِہٖ فَلْیَصِلْ اِخْوَانَ اَبِیْہِ بَعْدَہٗ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ: جو کوئی یہ چاہے کہ قبر میں اپنے باپ کو آرام پہنچائے اور خدمت کرے تو باپ کے انتقال کے بعد اس کے دوستوں اور بھائیوں کے ساتھ وہ اچھا برتاؤ

رکھے، جو رکھنا چاہیئے۔

۸: عَنْ اَبِیْ اُسَیْدِنِ السَّاعِدِیِّ قَالَ بَیْنَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ اِذْ جَآءَہٗ رَجُلٌ مِّنْ بَنِیْ سَلَمَۃَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ھَلْ بَقِیَ مِنْ بِرِّ اَبَوَیَّ شَیْءٌ اَبَرُّھُمَابِہٖ بَعْدَ مَوْتِھِمَا قَالَ نَعَمْ اَلصَّلٰوۃُ عَلَیْھِمَا وَالْاِسْتِغْفَارُ لَھُمَا وَاِنْفَاذُ عَھْدِ ھِمَا مِنْ بَعْدِ ھِمَا وَصِلَۃُ الرَّحِمِ الَّتِیْ لَاتُوْصَلُ اِلَّابِھِمَا وَاِکْرَامُ صَدِیْقِھِمَا۔

ترجمہ: حضرت ابو اسیدؓ ساعدی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ بنو سلمہ کا ایک آدمی آیا اس نے کہا یا رسول اللہ کیا ماں باپ کے مرنے کے بعد مجھ پر اُن کی جانب سے کوئی چیز واجب ہے کہ ان کے ساتھ کوئی نیکی کی جا سکے۔ فرمایا ہاں ان کی بخشش کے لیئے دعا کرنا، ان کی وصیت کو پورا کرنا اور اس رشتہ داری کو ملانا جو ان کے ساتھ ہی ملائی جا سکتی ہے ان کے دوستوں کی عزت کرنا۔

۹: وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ مِنْ اَبَرِّالْبِرِّ صِلَۃُ الرَّجُلِ اَھْلَ وُدِّاَبِیْہِ بَعْدَ اَنْ یُّوَلِّیَ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: باپ کی خدمت اور حسن سلوک کی ایک اعلیٰ قسم یہ ہے کہ ان کے انتقال کے بعد اُن کے دوستوں کے ساتھ (اکرام و احترام) تعلق رکھا جائے اور باپ کی دوستی و محبت کا حق ادا کیا جائے۔

۱۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّبْسَطَ لَہٗ فِیْ رِزْقِہٖ وَیُنْسَاَلَہٗ فِیْ اَثَرِہٖ فَلْیَصِلْ رَحِمَہٗ۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہا رسول ﷺ نے فرمایا کہ: جو کوئی یہ چاہے کہ اس کے رزق میں فراخی اور کشادگی ہو، اور دنیا میں اس کے آثار قدم تادیر رہیں (یعنی اس کی عمر دراز ہو) تو وہ (اہل قرابت کے ساتھ) صلہ رحمی کرے۔

۱۱: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ اَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ قَالَ اُمُّكَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمُّكَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اُمُّكَ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ اَبُوْكَ وَفِیْ رِوَیَةٍ قَالَ اُمُّكَ ثُمَّ اُمُّكَ ثُمَّ اُمُّكَ ثُمَّ اَبَاكَ ثُمَّ اَدْنَاكَ اَدْنَاكَ۔

ترجمہ: ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہا ایک آدمی نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ سب سے زیادہ کون لائق ہے جس کے ساتھ میں حسن سلوک سے پیش آؤں فرمایا تیری ماں اس نے کہا پھر کون فرمایا تیری ماں۔ اس نے کہا پھر کون فرمایا تیری ماں،اس نے کہا پھر کون فرمایا تیرا باپ۔ ایک روایت میں ہے تیری ماں پھر تیری ماں پھر تیری ماں پھر اپنے باپ کے ساتھ احسان کر،پھر جو تیرے قریبی رشتہ دار اور قریبی عزیز ہیں ان کے ساتھ۔

۱۲: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَغِمَ اَنْفُهٗ قِیْلَ مَنْ یَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَنْ اَدْرَكَ وَالِدَیْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ اَحَدَهُمَآ اَوْ كِلَاهُمَا ثُمَّ لَمْ یَدْخُلِ الْجَنَّةَ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کی ناک خاک آلودہ ہو اس کی ناک خاک آلودہ ہو اس کی ناک خاک آلودہ ہو۔صحابہؓ نے عرض کیا کس کی اے اللہ کے رسول ﷺ! فرمایا جو اپنے ماں باپ دونوں

کو یا کسی ایک کو بڑھاپے کی عمر میں پاتا ہے پھر (ان کی خدمت کر کے) جنت میں داخل نہ ہو۔

۱۳: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ اِنَّ اٰلَ اَبِیْ فُلَانٍ لَیْسُوْالِیْ بِاَوْلِیَآءَ اِنَّمَا وَلِیَّ اللّٰہُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنْ لَّھُمْ رَحِمٌ اَبُلُّھَا بِبَلَالِھَا۔

ترجمہ: حضرت عمروؓ بن عاص سے روایت ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے فلاں گھرانہ میرا دوست نہیں ہے میرا دوست اللہ ہے اور نیک مومن، ہاں اُن کے ساتھ رشتہ داری ہے اس کی تری کے ساتھ میں اس کو تر کروں گا۔

۱۴: وَعَنْ الْمُغَیْرَۃِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّھَاتِ وَوَأْدَالْبَنَاتِ وَمَنَعَ وَھَاتِ وَکَرِہَ لَکُمْ قِیْلَ وَقَالَ وَکَثْرَۃَ السُّوالِ وَاِضَاعَۃَ الْمَالِ۔

ترجمہ: حضرت مغیرہؓ سے روایت ہے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ماؤں کی نافرمانی کرنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑنا تمہارے لیے حرام قرار دیا ہے۔ بخیلی اور گدائی کو تم پر حرام کیا ہے اور بحث و مباحثہ (قیل وقال) اور زیادہ سوال کرنے اور مال ضائع کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔

۱۵: وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنُ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مِنَ الْکَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَیْہِ قَالُوْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَھَلْ یَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَیْہِ قَالَ نَعَمْ یَسُبُّ اَبَاالرَّجُلِ فَیَسُبُّ اَبَاہُ وَیَسُبُّ اُمَّہٗ فَیُسُبُّ اُمَّہٗ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہؓ بن عمر سے روایت ہے کہا رسول ﷺ نے فرمایا اپنے ماں باپ کو گالی دینا کبیرہ گناہ ہے۔صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیتا ہے فرمایا ہاں دوسرے آدمی کی ماں اور باپ کو گالی دیتا ہے وہ اس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے۔

۱۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْهُ قَامَتِ الرَّحِمُ فَاَخَذَتْ بِحَقْوِی الرَّحْمٰنِ فَقَالَ مَهْ قَالَتْ هٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِبِكَ مِنَ الْقَطِیْعَةِ قَالَ اَلَا تَرْضَیْنَ اَنْ اَصِلَ مَنْ وَّصَلَكِ وَاَقْطَعَ مِنْ قَطَعَكِ قَالَتْ بَلٰی یَا رَبِّ قَالَ فَذَاكِ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہا رسول ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا جب پیدا کرنے سے فارغ ہوا، رحم کھڑی ہوئی اور رحمٰن کی کمر پکڑ لی۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا ہے کہنے لگی یہ جگہ تیرے ساتھ قطع رحمی سے پناہ پکڑنے والے کی ہے۔ فرمایا تو اس بات سے راضی نہیں کہ جو تجھ کو ملائے میں اس کو ملاؤں گا اور جو تجھ کو کاٹے گا میں اس کو کاٹ دوں گا۔ اس نے کہا کیوں نہیں اے میرے رب فرمایا پھر تیرے ساتھ میرا یہ وعدہ ہے۔

۱۹: اعانتِ جُرم سے اجتناب

مجرم کی اعانت کسی صورت نہ کرے خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ۔ البتہ نیکی کے کاموں میں تعاون کرنا قرآنی حکم ہے۔ اسی طرح مجرم کی پشت پناہی ہرگز نہ کرے خواہ کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو۔ جرائم سے صرفِ نظر بھی نہ کرے۔ بعض لوگ فطرتاً جرائم پیشہ نہیں ہوتے مگر کسی خاص واقعہ سے متاثر ہو کر جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اگر اصلاح کا موقع دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر

کسی دوسرے کے حق پر سمجھوتہ نہ کرے۔ جرائم پیشہ افراد کو حکمران کی انصاف پسندی کا یقین ہو تو وہ یقیناً جرائم سے اجتناب برتیں گے۔ حکمران کی ترجیحات میں یہ بات ہونی چاہیئے کہ وہ جرائم کا قلع قمع کریں نہ کہ مجرموں کا کیونکہ ہر جرم کے پسِ منظر میں کوئی نہ کوئی ناانصافی ضرور شامل ہوتی ہے۔ اکثر بااثر حضرات، خاص کر حکمران، اپنے عزیز و اقارب کو قانون سے بالا تر سمجھتے ہیں اور ان کے جرائم کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ جس حکمران کے گرد ایسے افراد ہوں گے تو جرائم میں اضافے کو نہیں روکا جا سکتا۔ حکمران کو جرائم کی پشت پناہی یا ان سے چشم پوشی قطعاً نہیں کرنی چاہیئے۔ اس ضمن میں ایک حدیث مبارک ہے کہ قیس قبیلہ کی فاطمہ نامی عورت نے چوری کا ارتکاب کیا۔ قیس قبیلہ عربوں کا معزز اور شریف قبیلہ تھا۔ قبیلہ والوں کو اس چوری کے واقعہ سے سخت ندامت کا سامنا تھا۔ انھوں نے سفارش کا سہارا لینے کی کوشش کی اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سفارش کے لیئے منتخب کیا۔ آپؓ نبیﷺ کے پاس گئے اور فاطمہ بنتِ قیس کی سفارش کی کہ اُسے چوری کی سزا معاف کی جائے۔ نبیﷺ نے اس بات پر سخت ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ پہلی قوموں کے لوگ اس لیئے ہلاک کر دیئے گے کہ جب کوئی طاقتور آدمی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا تو اُسے سزا نہیں دی جاتی تھی اور اگر کوئی کمزور آدمی گناہ کرتا تو اُسے سزا دے دی جاتی۔ پھر فرمایا اگر میری بیٹی (فاطمہ بنت محمد ﷺ) بھی چوری کرتیں تو میں ان کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ جاہلیت کے دور کی اس خبیث عادت کا خاتمہ بھی حضورﷺ نے خود اپنی مثال سے فرمایا۔ لیکن ہمارے ہاں تو آج کل جرم کا بھی راج ہے جب کہ رشوت نے اس کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

اسی ضمن میں اور اسی طرح تاریخ کی ایک اور اہم اور بڑی مثال ہمارے

سامنے حضرت عمرؓ کے اپنے بیٹے کی ہے۔ جب اُن پر تہمت لگی تو حضرت عمرؓ نے اپنے ہاتھ سے اُسے سزا دی یہاں تک کہ اُس سزا کے دوران ہی بیٹے کی وفات ہو گئی تھی۔ قرونِ اولیٰ کی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ یہ مثالیں موجودہ حکمرانوں کے لیئے بھی سبق آموز اور نتیجہ خیز ہونی چاہئیں بشرطیکہ وہ ایسا کرنا بھی چاہیں۔ نیز اچھی حکمرانی کے تعین کے لیئے بھی گراں قدر رہنما اصول یہی ہیں۔ اگر کسی کو توفیق نصیب ہو۔

ہمارے معاشرے میں بڑی بدنصیبی ہے کہ مجرم یا جرم کی حمایت کو نہ صرف یہ کہ برا نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ احساس ہی مر گیا ہے کہ جرم کوئی بُری بات ہے۔ مغرب اور اس کے متعلق ممالک کے لوگ جن کو ہم برا کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ جہنم میں جائیں گے ان کے ہاں تو بعض اخلاقی جرائم کا تصور بھی شاید نہ ہو۔ مگر ہم جو جنت کے ٹھیکیدار ہیں جس سہولت اور بے خوفی کے ساتھ مجرموں کی حمایت کرتے ہیں اس کا جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم میں جو جتنا بڑا ہے وہ اتنا ہی جرم کو برا نہیں سمجھتا۔ خواہ وہ حکمران ہو، کسی خاندان کا بڑا ہو، بڑے قبیلے کا ہو یا مالدار ہو۔ یہ سب لوگ اپنے آپ کو قانون سے بالا تر، جرم سے پاک اور محفوظ سمجھتے ہیں بلکہ جرم کرنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ نتیجتاً وہ جرم کی حمایت کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر رشوت دے کر جرم سے بچنے کا رواج بھی عام ہے۔ چوری کے جرم کی ایک سمت یہ بھی ہے جیسا کہ اللہ کے حبیب ﷺ نے فرمایا ''نماز میں بھی چوری ہے''۔ یعنی رکوع، سجود وغیرہ ٹھیک طریقے سے ادا نہ کرنا بھی چوری ہے۔ چوری کا ذکر آیا تو یہ بھی بتانا ہے کہ جیسا کہ میں نے کہا دوسرے کئی جرائم کی طرح چوری کا عنصر بھی انسانی کیمسٹری کا

حصہ ہے۔ اس عادت والے کو اگر چوری کرنے کا موقع نہ ملے تو وہ اپنی ہی چیزیں ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھتا ہے اور اس طرح جرم کی خواہش کو پورا کرتا ہے۔ یہی حال تمام جرائم کا ہے۔ بعض جرائم کے لیئے سنگین سزائیں بھی مقرر ہیں جس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کا علاج کسی دوسرے طریقے سے نہیں ہو سکتا۔ کہنے کو تو مجرم یا جرم کی حمایت کرنے کو سب ہی لوگ بُرا سمجھتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے اور اسلام کے نقطۂ نظر سے اور بھی سنگین معاملہ ہے۔ جرم یا مجرم کی سفارش کرنے کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقِيْتًاo ترجمہ: ''جو شخص اچھی سفارش کرے گا اُس میں اُس کا حصہ ہے اور بُری سفارش کرنے والے کا بوجھ اُسی پر ہے، اور اللہ ہر چیز کا حساب دان ہے''۔

تجربہ سے ثابت ہے کہ جرم کی سفارش اکثر وہ لوگ کرتے ہیں جن کے اپنے مزاج میں جرم ہوتا ہے جس وجہ سے وہ ایسا کرتے ہیں۔ جرم کی سفارش کرنے والوں کے اس عمل سے معاشرے میں جرائم کے پھیلاؤ کا کتنا اثر ہوتا ہے بہت واضح ہے۔ یہ سب امور سنجیدگی سے غور طلب ہیں۔ اس طرح مجرم کی حمایت نہ کرنا بھی مشکلات سے خالی نہیں۔ مثلاً برادری، رشتہ داری، دوستی، سیاسی تعلقات آڑے آتے رہتے ہیں۔ اس لیئے صحیح جوانمردی اور انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ کسی مجرم کی سفارش سرے سے کی ہی نہ جائے بلکہ اس سے آگے کا مرحلہ یہ ہے کہ مجرم کی حمایت دل میں بھی نہ ہو۔ اللہ توفیق دے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ کسی گناہ گار کو چھوڑ دینا اتنا بڑا جرم نہیں

ہے جتنا کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرانا ہے۔ آج کل یہ بھی رسم عام ہے کہ رشوت یا سفارش کی بناء پر مجرموں کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور بے گناہوں کو سزا دی جاتی ہے۔ جرم کی حمایت کرنے میں ایک دوسرا تباہ کُن نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انصاف کمزور ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ وہ بات ہے جس کا اسلام نے خاص طور پر نوٹس لیا ہے اور دورِ جاہلیت کی اس رسم کو ختم کیا ہے کہ جہاں بڑے لوگوں کے جرم کو پناہ ملتی تھی اور چھوٹے لوگ زیرِ عتاب ہوتے تھے۔ لیکن آج کل ہمارے ہاں پھر وہی دورِ جاہلیت کا معاشرہ ترتیب پا رہا ہے۔

جُرم کا عنصر اور اُس کی قسم جو بھی ہو وہ انسان کی کیمسٹری میں ہوتا ہے اور حمایت کرنے والوں کی کیمسٹری میں بھی اسی کا اثر ہوتا ہے۔ تب ہی وہ شوق سے جرم کی حمایت کرتے ہیں۔ اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں ہے بلکہ ہمارے مشرقی معاشرے میں جرم کی حمایت اکثر بڑے لوگ ہی کرتے ہیں اور بعض بڑے لوگوں نے تو جیسا کہ عام طور پر کہا اور سُنا جاتا ہے کہ پیشہ ور مجرم بھی پال رکھے ہوتے ہیں۔ اس میں انتظامیہ کا بھی کافی حصہ ہوتا ہے۔ میں نے ۱۹۵۲ء کے دوران جیل میں دیکھا کہ جیل کی انتظامیہ کچھ پیشہ ور مجرموں کو رات کو نکال دیتی تھی اور وہ جرم کر کے صبح سے پہلے واپس جیل میں آ جاتے تھے۔ اُن کو کوئی کیسے پکڑ سکتا ہے۔

جُرم اپنی نوعیت کے اعتبار سے دو طرح کا ہے۔ ایک وہ جو حادثاتی ہے یعنی کسی حادثے سے جرم سرزد ہو جاتا ہے اور ایک جرم وہ ہے جو پوری منصوبہ بندی اور تیاری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی تیاری میں تمام متعلقہ اہلکاران بھی اپنا پورا کردار ادا کرتے ہیں۔ سزا جزا میں اگرچہ کوئی تخصیص نہیں کی جا

سکتی تاہم مجرموں کی پہلی قسم قابل اصلاح ہے جب کہ دوسری قسم ناقابل اصلاح۔ مثلاً چوری میں کہ اگر وہ حادثاتی ہے تو اُس کی وہ سزا نہیں ہے جو پیشہ ورانہ طور پر منصوبہ بندی سے کی گئی چوری کی ہونی چاہیئے۔ لہذا ایسی صورت پیش آنے پر حکمران کو بلا رو رعایت قانون کے نفاذ کو یقینی بنانا چاہیئے۔

یہاں اس وضاحت کی بھی ضرورت ہے کہ ایک تو کسی شخص کا ذاتی فعل ہے جو اُس کی ذات تک محدود ہے یعنی اللہ اور رسولﷺ کے حقوق میں کوئی کوتاہی یا لاپرواہی۔ یہ وہ جرم ہے جس کے لیئے توبہ کا دروازہ قیامت تک کُھلا ہے۔ یعنی اگر کوتاہی اور لاپرواہی کا مرتکب اس دنیا سے چلا بھی جائے تو اُس کے ورثاء اور اولاد اُس کی مغفرت کے لیئے اللہ تعالیٰ سے دعا کر سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بخشنے والے ہیں۔ اُس کے گناہ معاف کر دیں گے۔ لیکن انسانوں کو اذیت پہنچانے اور اُن کی حق تلفی کرنے کا جرم ایسا ہے کہ اُس کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں کہ جس کو تکلیف پہنچائی ہے اُس سے معافی مانگی جائے یا وہ سزا بھگتے۔ قیامت کے دن اُسے کوئی معافی نہیں دی جائے گی۔ جب کہ دوسری کوتاہیوں کے لیئے اگر کسی زندہ شخص نے دوسرے کی مغفرت کے لیئے صدقہ کیا ہو، دعائے مغفرت کی ہو تو اُس کا اثر اپنی جگہ ضرور ہو گا۔ لیکن بندوں کا جو حق ہے اُس پر معافی کی کوئی صورت نہیں۔ یہاں بڑے کو چھوٹے کی حق تلفی پر کوئی چھوٹ نہیں مل سکتی۔ لہذا حکمرانوں اور اصحابِ اقتدار کو خواہ وہ کسی بھی درجہ پر ہوں اس ضمن میں بہت محتاط رہنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے۔ آمین!

۲۰: <u>احتساب</u>

احتساب کا مؤثر نظام قائم کرے اور سب سے احسن احتساب یہ ہے کہ

حکمران انتظامیہ کے متعلق شکایات کو براہ راست سنے جیسے سیدنا عمرؓ مالِ غنیمت تقسیم فرمانے کے بعد خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ لوگو اپنے ساتھ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ انصاف کرو۔ ایک اعرابی کھڑا ہو گیا اور کہا امیر المومنین! مجھے مال غنیمت سے ایک چادر ملی ہے اور آپؓ نے دو چادریں زیب تن کی ہوئی ہیں۔ آپؓ نے وضاحت کے لیئے فوراً اپنے بیٹے عبداللہؓ کو طلب فرمایا، انھوں نے فرمایا کہ میرے باپ کا قد لمبا ہے ایک چادر ان کے لیئے نا کافی تھی اس لیئے میں نے اپنے حصے کی چادر ان کو دے دی۔

۲۱: سیاسی اخلاقیات

سیاسی اختلافات میں بھی رواداری اور اخلاقیات کو قائم رکھنا چاہیئے۔ ہمارے اور سردار ابراہیم خان مرحوم کے درمیان سخت اختلافات تھے لیکن میں نے پابندی لگا رکھی تھی کہ کوئی کارکن اُن کے خلاف جواب الجواب بیان نہ دے۔ سیاست میں اخلاقیات کا خیال نہ رکھنے سے سیاست محض بد اخلاقی، فریب اور دھوکہ بن کر رہ جاتی ہے۔

۲۲: خود احتسابی

حکمرانی کے ضمن میں خود احتسابی ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ ہر حکمران اور اس کی حکومت کے اراکین، عدلیہ، انتظامیہ، کا ہر شخص سونے سے پہلے اس بات پر غور کرے کہ اُس کا آج کیسا گزرا۔ اُس نے کیا اچھا کِیا اور کیا بُرا کِیا۔ یہ بات اس حدیث مبارک کے عین مطابق ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''عقلمند وہ شخص ہے جو ہر روز اپنے آپ سے حساب لے اور موت کے بعد کی زندگی پر توجہ مرکوز رکھے''۔ اسی طرح ذاتی، حکومتی اور عوامی معاملات پر غور کرے۔ خود احتسابی کے عمل

کو عام کرنے کے لیئے چھوٹے چھوٹے ادارے قائم کرے۔ اس طرح کی خود احتسابی ایک فرد کے لیئے بھی عظیم الشان ہے لیکن اگر پوری قوم ایسا کرے تو اس کا تو جواب ہی نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

؎ مانند شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو روز و شب اپنے عمل کا حساب

۲۳: عصبیت

ہمارے ہاں سیاست میں عصبیت کا بڑا ہی تباہ کن کردار ہے۔ عصبیت خواہ کیسی ہی ہو، برادری کی ہو، فرقہ، زبان، علاقہ یا رنگ ونسل کی ہو یہ سب اس ملّت کو پارہ پارہ کرنے کا سبب ہیں۔ ہمارے دشمن اسی کے ذریعے اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ انگریز نے یہی حکمت عملی اپنائی اور کامیابی حاصل کی۔ ہماری سیاست تو عصبیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بڑی برادریوں والے چھوٹی برادریوں کو ان کے حقوق سے محروم کر دیتے ہیں جس کے باعث ایک دشمنی اور ذہنی افراتفری جنم لیتی ہے۔ آگے چل کہ یہ افراتفری ملک کے اندر عدم استحکام پیدا کرتی ہے اور محروم طبقہ بڑی برادریوں کے خلاف منفی جدو جہد کرتا ہے۔ حالانکہ اسلام کے اندر برادری کا مطلب صرف تعارف ہے نہ کہ باعث فخر۔ بڑی برادریوں والے تمام حقوق کو تنہا اپنا ہی حق سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے تو یہ کہا: یَـاَیُّھَاالنَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِّنْ ذَکَرٍوَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْباً وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقَاکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ: ترجمہ: ''اے لوگو ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے کنبے اور قبیلے بنا دیئے ہیں اس لیئے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا

وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔ یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ دانا اور با خبر ہے''۔ اسی ضمن میں ایک حدیث مبارکہ ہے کہ ''لَا عَصَبِیَّۃَ فِی الْاِسْلَام''۔ ترجمہ: ''اسلام کے اندر عصبیت (برادری کا تعصب) نہیں ہے''۔ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ایک شہزادے نے اسلام قبول کیا اور اس کے بعد احرام باندھ کر بیت اللہ شریف کا طواف کرنے لگا۔ دوران طواف اس کی چادر پر ایک غلام کا پاؤں آ گیا۔ اُس نے پیچھے مڑ کر غلام کے منہ پر طمانچہ مارا۔ غلام سیدھا حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور اپنا سارا مقدمہ حضرت عمرؓ کو سنایا۔ آپؓ نے اس شہزادے کو طلب فرمایا اور فرمایا ''اے شہزادے اس زیادتی کا تمہیں قصاص دینا پڑے گا'' تو وہ شہزادہ تھوڑا سوچ میں پڑ گیا اور کہا کہ میری خاندانی شرافت کا کیا بنے گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام کے اندر غلام اور آقا دونوں برابر ہیں۔ گورے کو کالے پر، عرب کو عجمی پر اور آقا کو غلام پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ چنانچہ وہ مرتد ہو کر واپس چلا گیا۔ اس واقعہ کا مقصد واضح ہے کہ اسلام کے اندر کسی قسم کے قومی، لسانی، علاقائی اور رنگ و نسل کے تعصّبات و تفاخرات کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اسلام تو ان تمام تعصّبات کا قلع قمع کرتا ہے۔ تعصّب ایک لعنت ہے۔ برادریاں، قبیلے، خاندان اور ان کی شاخیں تو برحق ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر یہ بھی فرمایا کہ یہ تقسیم ایک دوسرے پر برتری کے لیئے نہیں بلکہ محض پہچان کے لیئے ہے۔ نا لائق سیاست کاروں نے اس عصبیت میں حتی المقدور اضافہ کیا ہے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیئے مذہب، فرقہ، ملک، قبیلہ اور خاندان غرضیکہ ہر طریقہ سے اس امت کو تقسیم در تقسیم کیا ہوا ہے۔ کچھ اسی طرح کا حال مذہبی جماعتوں کا بھی ہے۔ بلکہ بدتر ہوتا جارہاہے۔ برادری، علاقائی اور نسلی تعصّبات کو انگریز نے برصغیر میں بہت فروغ دیا بلکہ فرقہ واریت کے بانی بھی انگریز ہی ہیں۔

ان تعصّبات کو انگریز نے فوج کے اندر بھی اچھی طرح پالا۔مثلاً یہ تقسیم فوج کے اندر پنجاب رجمنٹ، بلوچ رجمنٹ، فرنٹیر کور، سندھ کور، وغیرہ کی شکل میں کی گئی۔ کیا ابھی ان تعصّبات کو ختم یا کمزور کرنے کا وقت نہیں آیا۔ آج ہمارا وطنِ عزیز ان ہی تعصّبات کے باعث خانہ جنگی کی طرف رواں دواں ہے۔ ایک غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ ہم برادریوں، فرقوں اور مسالک وغیرہ کو ہی سرے سے بُرا کہتے ہیں حالانکہ قبائل کی تقسیم کوئی بُرائی نہیں ہے۔ بلکہ برائی وہ ہے جسے فرقہ واریت یا برادری ازم کہتے ہیں۔ فرقہ واریت یہ ہے کہ میرا فرقہ بہتر ہے اور دوسرا کمتر ہے۔ برادری بھی بُری بات نہیں ہے بلکہ برادری ازم بُری بات ہے۔ اس کا مطلب بھی وہی ہے کہ دوسری برادریوں کو کمتر سمجھا جائے۔

۲۴: رشوت

جب ہم اچھی حکمرانی کا ذکر کرتے ہیں تو اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ ہم کچھ بنیادی خرابیوں کا تذکرہ کریں کیونکہ جب تک ان کی اصلاح نہیں ہوتی تب تک نئی عمارت تعمیر نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ان خرابیوں میں سے ایک لعنت رشوت خوری ہے۔ اس ملک میں کسی وقت لوگ رشوت کا نام سن کر شرمندہ ہوتے تھے مگر آج سب سے بڑا رشوت خور سب سے زیادہ معزز ہے۔ رشوت کو برا کہنے والے بھی ہیں مگر وہ ڈرتے ہیں کہ کوئی بڑا آدمی سن لے گا۔ اگر یہ فی الواقعہ کوئی بڑی برائی ہے تو اس کا علاج کیا ہے۔ اس وقت رشوت کا کاروبار بڑے لوگوں میں سب سے زیادہ ہے۔ بلکہ شروع ہی اُن سے ہوتا ہے۔ چھوٹے لوگ تو محض ایجنٹ کا کام کرتے ہیں۔ رشوت ستانی کی جو بھی دوسری خرابیاں ہوں مگر جو بات اللہ کے رسول ﷺ نے فرمائی ہے اس سے بڑھ کر کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ آپ ﷺ نے

فرمایا: ''اَلـرَّاشِـیُ وَالْـمُرْتَشِیُ کِلَا هُمَا فِی النَّارِ'' ترجمہ: ''رشوت لینے اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں''۔ (الحدیث) جن کا ایمان و یقین اللہ کے رسول ﷺ پر اور ان کی تعلیمات پر ہے ان کے لیئے اس سے زیادہ بدخبری اور کیا ہوسکتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں رشوت ستانی کا مرتبہ کیا ہے۔ کہاں تک جائز ہے اور کہاں تک ناجائز ہے لیکن ہمارے برصغیر میں تو یہ لعنت ہمہ گیر ہے اس کا رواج بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس کو برا کہنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بھی ابھی کافی ہو گی۔ حکومتی سطح پر رشوت کے انسداد کے لیئے کئی کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں مگر وہ الٹا رشوت خوری میں اضافے کا باعث بنی ہیں۔ جن کو رشوت کے خاتمے کا کام سپرد کیا جاتا رہا انھوں نے موقع غنیمت سمجھا اور دونوں ہاتھوں سے لُوٹا۔

اس کو ختم کرنے کا ایک مؤثر طریقہ تو یہ ہے کہ بڑے عہدوں پر فائز حضرات از خود اس امر کا عہد کرلیں کہ اس لعنت کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ اگر ایسا ہو جائے یا جہاں بھی ہو جائے تو اگر سو فیصد نہیں تو نوے فیصد رشوت خوری خود ہی بند ہو جائے گی۔ کئی لوگوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ جب حج کر کے واپس آئے تو انھوں نے توبہ کر لی۔ اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا دوسرا مؤثر طریقہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجوں پر فائز ذمہ دار حضرات عوام کی شکایات کو کھلے بندوں سُنیں۔ اس سے بھی خود بخود رشوت خوری پر گرفت ہو جائے گی۔ ایک تیسرا اور زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے جو کام سرکاری اہلکاروں کے متعلق ہوتے ہیں ان کے لیئے کوئی ایسا موثر نظام وضع کیا جائے اور وہ مشکل بھی نہیں ہے کہ لوگوں کے تمام کام پیچھا کرنے کے منتظر نہ ہوں۔ بلکہ اپنے وقت پر خودبخود ہو جانے چاہئیں جیسا کہ اس وقت ترقی یافتہ ممالک میں ہو رہا ہے۔ اس بات سے

بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ اسی فیصد سے زیادہ یہ لعنتی کاروبار بند ہو جائے گا۔ سو فیصد خاتمہ کا تو خیال ہی چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ جن کے خون میں کئی پشتوں سے حرام داخل ہو گیا ہے وہ اگر توبہ بھی کر لیں تب بھی مکمل اصلاح شاید ممکن نہ ہو۔

چوتھا طریقہ یہ بھی ہے کہ سرکاری ملازمین کے لیئے ہر ماہ مختلف درجوں میں اخلاقی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ مرکزی سیکرٹریٹ سے شروع کر کے تمام اضلاع تک۔ اس سے بھی کسی نہ کسی حد تک اصلاح احوال لازماً ہو گی۔ اس کا کچھ تجربہ میں نے کیا تھا اور مفید نتیجہ بھی نکلا تھا۔ آخر کوئی نہ کوئی تو اچھی بات سن کر متاثر ہوتا ہی ہے۔ بشرطیکہ کہنے والا خود (رشوت خوری کا) مرتکب نہ ہو۔

انسداد رشوت کے باب میں ایک واقعہ جو احادیث کی معتبر کتب میں موجود ہے اس سے رشوت کی مختلف اقسام اور طریقوں کا پتا چلتا ہے۔ آپ ﷺ نے ایک صحابیؓ کو زکوٰۃ اور عشر کی وصولی پر مامور فرمایا وہ صحابیؓ زکوٰۃ کے محصولات لے کر واپس لوٹے تو آپ ﷺ نے اس کے پاس دو قسم کے مال دیکھے وہ صحابیؓ خود ہی کہنے لگے کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ زکوٰۃ کے محصولات ہیں اور دوسری قسم کا مال وہ ہے جو لوگوں نے مجھے زکوٰۃ کے علاوہ ہدیہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس وضاحت کو سخت ناپسند فرمایا۔ آپ ﷺ تکیہ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے آپ ﷺ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور غصہ کے انداز میں فرمایا کہ اے شخص تیری ماں تجھے روئے کیا یہ زکوٰۃ کے علاوہ جو مال لوگوں نے تجھے پیش کیا اگر تم گھر میں بیٹھے ہوتے تو کیا پھر بھی تجھے یہ مال لوگ پیش کرتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے لوگو یہ منصب کی رشوت ہے۔ پھر بعض علاقوں میں جہاں اسلام نیا نیا گیا تھا اور

لوگ بھی پوری طرح اسلام سے واقف نہ تھے وہاں سے اکثر اس قسم کی شکایات موصول ہوتی رہیں جب کہ بعد میں ان باتوں کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا۔

ہمارے سیاسی نظام میں بھی اس طرح کی رشوت عام ہے اور اکثر رشوت دینے اور لینے والے دونوں اس کو ہدیہ یا دعوت سمجھتے ہیں۔ ایک پڑوسی ملک میں سرکاری طور پر ہدیہ کے نام سے رشوت لینا کھلے بندوں جائز ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جب ایسے ملازمین حکومت یا اپنے سرکاری منصب سے الگ ہوتے ہیں تو ایسے ہدیے یا تو بالکل ختم ہو جاتے ہیں یا کم ہو جاتے ہیں۔ لینے اور دینے والے دونوں اپنے آپ کو شریعت کے اس پیمانے پر پرکھ لیں۔ آپﷺ کا فرمان ہے کہ رشوت لینے اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ کہیں ہم شعوری یا غیرشعوری طور پر اس گھناؤنے جرم کے مرتکب تو نہیں ہو رہے۔ اکثر علماء ومشائخ، سرکاری ملازمین، حکمران اور بااثر طبقات مختلف زاویوں سے اس گناہ میں ملوث ہیں۔ اس قسم کی ملعون رشوت کو قرآن نے بیان فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وِ الرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہ: ترجمہ: ''اے ایمان والو اکثر علماء و مشائخ لوگوں کا مال باطل ہتھکنڈوں سے ہڑپ کرتے ہیں اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں''۔ قرآن نے رشوت کی یہ واضح تعریف فرمائی ہے جو معاشرے کے تمام طبقات کے لیئے صادق آتی ہے۔ ہر کوئی اپنا احتساب اس پیمانے پر کرے تو بے شمار بیماریوں سے نجات مل سکتی ہے۔ اس سے صرف جو ذہنی سکون ہی حاصل ہو گا اُسی کی کوئی قیمت نہیں۔

۲۵: خوشامد، چغلی، غیبت

خوشامد اور بے جا تعریف کرنے والوں سے دور رہے۔ یہ کام حکومت میں سب سے مشکل ہے کیونکہ انسان پیدائشی طور پر تعریف وخوشامد پسند واقع ہوا ہے جس طرح اپنی تعریف میں بات سننے کو پسند کرنا خوشامد پسندی ہے اسی طرح اپنے خلاف بات کو نا پسند کرنا بھی درحقیقت خوشامد ہی کا حصہ ہے۔ خوشامدیوں سے بچنے کی توفیق اللہ تعالیٰ سے مانگتا رہے۔ حکومت کے کاموں میں ایک بڑا اہم کردار خوشامدیوں کا ہوتا ہے بلکہ باالفاظ دیگر حکومت کے اہم فیصلے خوشامدیوں کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ کوئی بھی حکمران خوشامدیوں کے نرغے سے نہیں بچ سکتا اور یہ ٹولہ ہر ذہین سے ذہین حکمران کے گرد ہوتا ہے۔ اس ٹولے کو ایسا گُر آتا ہے جس سے بچنا محال ہوتا ہے۔ یہ گروہ حکمران کی کمزوریاں تلاش کر لیتا ہے اور ان کمزوریوں کو حکمران کے خلاف اور اپنے حق میں استعمال کرتا ہے۔ یہ بات میں اس لیئے کہہ رہا ہوں کہ ان باتوں کا مجھے بار ہا مشاہدہ اور تجربہ ہوا ہے۔ میرے پاس لوگ آتے تھے اور تصوف سے میری دلچسپی کو بھانپ کر تصوف پر بڑی جچی تُلی عالمانہ گفتگو کرتے تھے اور اس نشست کے لیئے خوب تیاری کر کے آتے تھے۔ مجھے اُن کو دیکھ کر اور سن کر یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ جھوٹے لوگ ہیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ میں وادیٔ نیلم کے دورے پر جا رہا تھا تو دورانِ سفر ایک شخص میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ آپ بڑے ولی اللہ ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ ولی اللہ ہیں، کہنے لگا کہ نہیں میں تو گناہ گار ہوں۔ میں نے ''ولی را ولی می شناسد'' کے اصول کے تحت کہا کہ ولی اللہ کو تو ولی اللہ ہی پہچانتا ہے۔ اگر مجھے اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہو تو میں چلتی گاڑی سے تمہیں دھکا دے دوں۔ حکمران کو چاہیئے کہ خوشامد کرنے والوں سے کوسوں دُور بھاگے اور

تنقید کرنے والوں کو اپنے ساتھ رکھے۔ خوشامدیوں کا ایک اور طریقہ واردات بار ہا تجربہ میں آیا ہے کہ خوشامدی حکمران کی تقاریر کو بہت سراہتے ہیں۔ حکمران کو چاہیئے کہ نہ تو اپنی شکل و صورت سے متعلق تعریف سنے اور نہ تقریر و تحریر کی۔ اچھی تقریر و تحریر، سیرت و صورت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ سمجھے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ اس بات کو بھول جائے کہ اس میں اُس کا ذاتی کمال ہے بلکہ ہر اچھی بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل سمجھے۔ اپنے قول و فعل میں تضاد کو ختم کرے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ''اے ایمان والو تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں''۔ اس حکم کو اپنے لیئے رہنما اصول سمجھے۔ میرا حکمرانوں کو ''**مشورہ**'' ہے کہ جو سرکاری ملازم حکمران کی تعریف کرے اُس کو فوری طور پر اس کے فرائض منصبی سے الگ کرتے ہوئے اپنے سے دُور کر دیا جائے۔ خوشامدی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہر وقت خیال میں رہے: ''منہ پر تعریف کرنے والے کے منہ میں مٹی ڈالو''۔ خوشامدیوں کے بارے میں ایک بڑی اہم مثال ہے جس کا مجھے تجربہ ہوا اور اس کے بعد بڑی تبدیلی بھی واقع ہوئی۔ ۱۹۵۶ء میں جب میں صدر بنا تو جن لوگوں کو میرا صدر بننا پسند نہ تھا انھوں نے قائد ملت چوہدری غلام عباس اور میرے درمیان اختلافات کو ہوا دی اور اس کام کے لیئے ایسے لوگوں کو استعمال کیا جو قائد ملت کے نزدیک انتہائی معتبر تھے۔ ایک صاحب اُن لوگوں کو اپنے پاس بلاتے اور میرے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرتے جو قائد ملت تک پہنچائی جاتیں اور انھیں بتایا جاتا کہ میں اُن کی عزت نہیں کرتا اور مزید یہ کہ میں نے اپنے ذاتی استعمال کے لیئے ۱۵۰۰۰ (پندرہ ہزار) روپے کے عوض پلنگ خریدا ہے۔ جب کہ یہ بات معروف ہے کہ میں ایک زمانے سے فرش پر سوتا ہوں۔ خوشامدیوں کی باتوں میں آ کر قائد ملت مجھ سے ناراض ہوئے اور یوں بالآخر مجھے صدارت

بھی چھوڑنا پڑی جس کی بنیادی وجہ یہی خوشامدی گروہ تھا۔ جب بعد میں قائد ملت کو حقیقت کا علم ہو گیا اور انھوں نے مجھ سے ذکر بھی کیا تو میں نے اُن کے بڑے پن کی وجہ سے کہا کہ ایسی ہزار صدارتیں آپ کے حکم پر قربان کی جا سکتی ہیں۔ آپ نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر عملدرآمد ہو لینے دیں۔ اس بات سے خوشامدی ٹولے نے خوشیاں منائیں کہ ہم نے قائد ملت سے بدلہ لے لیا ہے۔ یہ بات میں نے خود ان سے سنی۔ بلکہ میرا تو یہ مشورہ ہے کہ بے جا تعریف کرنے والوں کو مجلس سے نکال دینا چاہیئے تاکہ وہ دوسروں کے لیئے عبرت ہو۔ خوشامدی لوگ بے عقیدہ ہوتے ہیں ان کا کوئی دین مذہب نہیں ہوتا۔ وہ اس تاک میں ہوتے ہیں کہ کب حکومت تبدیل ہو اور وہ آنے والی حکومت کے ساتھ پہلے ہی اپنے راہ و رسم استوار کریں۔ خوشامدی اکثر و بیشتر شیکسپیئر کے ایک تاریخی ڈرامے کے کردار Brutus کی طرح ہوتے ہیں بلکہ حکومت کے مخالفین کو در پردہ پوری محنت کے ساتھ اطلاعات بھی فراہم کرتے رہتے ہیں۔ سوائے قائد اعظمؒ کے تقریباً سب حکمران خوشامدیوں کے نرغے میں ہی رہے۔

چغلی خوشامد سے بھی بد تر ہے۔ اس لیئے کہ خوشامد تو کوئی شخص اپنے کسی فائدے کے لیئے کرتا ہے۔ لیکن چغلی تو ایسا حرام فطری فعل ہے کہ اس کا مقصد اپنے مقاصد کے حصول کے ساتھ ساتھ دوسروں کو نقصان پہنچانا بھی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں حدیث مبارک ہے کہ: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ قَتَّاتٌ o ترجمہ: ''چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔ (الحدیث)۔ چغل خوری کی سزا بھی اسی نسبت سے ہے۔ جس طرح لوگ خوشامد کو پسند کرتے ہیں اسی طرح اکثر و بیشتر لوگ چغلی کو پسند کرتے ہیں۔ چغل خور کا مقصد محض اپنا فائدہ ہی نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کا

نقصان زیادہ تر مدنظر ہوتا ہے۔ جو لوگ چغلی کو پسند کرتے ہیں ان کو اگر سچی بات کا پتا بھی چل جائے تب بھی وہ اسی چغلی کو ہی درست سمجھتے رہتے ہیں۔ چغلی کے لیئے ضروری نہیں ہے کہ کسی درست بات کا ذکر کیا جائے بلکہ چغل خور خود اپنے سے ہی من گھڑت بات بنا لیتے ہیں۔ یہ بڑا المیہ ہے۔ اگر چغلی سن کر اس کے صحیح یا غلط ہونے کی کچھ تحقیق کر لی جائے تاکہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو تب بھی کچھ اصلاح ہوسکتی ہے۔ قرآن کریم نے کتنی واضح بات فرمائی ہے کہ:

یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَ کُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًا بِجَھَالَۃٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِیْنَ o ترجمہ: ''اے مسلمانو! اگر کوئی فاسق تمہیں خبر دے تو تم اُس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچا دو پھر اپنے کیئے پر پشیمانی اٹھاؤ''۔ مگر چغلی پسند کرنے والے اسی من گھڑت بات کو ہی ایمان کا حصہ سمجھتے رہتے ہیں۔ یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں کسی خاص علم سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ تو گھروں میں روزمرّہ کا معمول ہے۔ ہمارے اپنے گھر سے لے کر ایک عام شخص کے گھر تک یہ لعنت پوری طرح سے اثر انداز ہے۔ ہمارے اپنے گھروں میں کتنے ہی تنازعات ایسے ہیں جو محض چغل خوری کے باعث ہوتے ہیں۔ اکثر جھگڑے اور فساد محض جھوٹی اطلاعات یعنی چغل خوری کی بنیاد پر ہی ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک حدیث مبارکہ ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِالرَّحمٰنِ بْنِ غُنْمٍ وَاَسْمَاءَ بِنْتِ یَزِیْدَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ خِیَارُ عِبَادِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ اِذَا رَأُوْا ذُکِرَ اللّٰہُ وَشِرَارُ عِبَادِ اللّٰہِ الْمُتَأَوِّنُوْنَ بِالنَّمِیْمَۃِ الْمُفَرِّقُوْنَ بَیْنَ الْاَحِبَّۃِ اَلْبَاغُوْنَ الْبُرَاءَ الْعَنَتَo (احمد والبیہقی)

ترجمہ: ''عبدالرحمٰن بن غنمؓ اور اسماء بنتِ یزیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ یاد آئے اور بدترین بندے

وہ ہیں جو چغلیاں کھانے والے، دوستوں میں جدائی ڈالنے والے ہیں اور جو اس کے طالب اور ساعی رہتے ہیں کہ اللہ کے پاک دامن بندوں کو کسی گناہ سے ملوث یا کسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا کریں"۔ اس حدیث میں اللہ کے اچھے بندوں کی یعنی اللہ والوں کی نشانی یہ بتلائی گئی ہے کہ ان کے دیکھنے سے اللہ یاد آئے اور بدترین انسان اُن لوگوں کو قرار دیا گیا ہے جو عادۃً چغلخور ہوں اور چغلیاں کھا کھا کے دوستوں میں پھوٹ ڈلوانا جن کی عادت اور جن کا دلچسپ مشغلہ ہو اور جو اللہ کے بندوں کو بدنام اور پریشان کرنے کے در پے رہتے ہوں۔ پس آدمی کو چاہیئے کہ وہ صحبت و محبت کے لیئے ایسے بندوں کو تلاش کرے جن کے دیکھنے سے دل کی غفلت دور ہو اور اللہ یاد آئے اور جن کے پاس بیٹھنے سے دل میں زندگی اور بیداری پیدا ہو اور اس کے برخلاف جو ناخداشناس اور موذی لوگ دوسروں کی برائی کے در پے رہتے ہوں اور اُن کو بدنام کرنا اور نقصان پہنچانا جن کا خاص مشغلہ ہو اُن سے بچے اور اُن کے بُرے اثرات سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرتا رہے۔مگر بہت کم لوگوں میں یہ اخلاقی جرأت ہوتی ہے جو کسی بات کے غلط ثابت ہونے پر اس کی اصلاح کرلیتے ہیں۔ حکومت ہو، سرکاری ملازمین ہوں یا گھریلو ملازمین ہوں کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جو اس لعنت کے اثر سے محفوظ ہو۔ کسی ایک غلط خبر پر سال ہا سال لوگ ناراض رہتے ہیں۔ بعض لوگوں کا تو یہ بہترین مشغلہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پاس سے بات گھڑ کر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ خاندانوں کے خاندان آپس میں ناراض رہتے ہیں۔ غالبًا یہی وہ کام ہے جو ابلیس کا بھی پسندیدہ ہے۔ کچھ استثنیٰ بھی ضرور ہو گا۔ ہمارے پہلے اومبڈسمین جسٹس ملک اقبال صاحب کو میں نے دیکھا تھا کہ اگر کوئی ملازم ان کے کان میں کسی کے خلاف کچھ کہتا تو وہ ان کو رو برو کروا دیتے جس سے لازماً پھر چغل خوری کا سلسلہ بند ہو گیا

ہو گا۔

اسی طرح غیبت بھی اسی برے قبیلے کی بدترین شاخ ہے۔ اس کا ذکر بھی قرآن حکیم نے بطور خاص کیا ہے اور غیبت کرنے کو اپنے بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی ہے۔ آج کل کون سی مجلس ہے جس میں غیبت نہیں ہوتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ o ترجمہ: ''اے ایمان والو بہت بدگمانیوں سے بچو۔ تحقیق بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔ اور بھید نہ ٹٹولا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کیا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے تم کو اس سے گھن آئے گی''۔ اس آیت میں تین قسم کے بے لذّت گناہوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اسی طرح آپﷺ نے فرمایا کہ: اَلْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا ترجمہ: ''غیبت زنا سے زیادہ بڑا گناہ ہے''۔ ضروری وضاحت کے طور پر عرض ہے کہ بعض لوگ غیبت کی غلط تشریح کرتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ ہم جس بات کا تذکرہ کر رہے ہیں وہ سچ ہے اور وہ بات اُس شخص میں سو فیصد موجود ہے۔ اسی طرح صحابہؓ کو بھی یہی اشکال پیدا ہوا۔ انھوں نے رسولﷺ سے بیان کیا جس پر آپﷺ نے فرمایا کہ: ''جو بات تم کسی دوسرے کے بارے میں اُس کی عدم موجودگی میں کرتے ہو اور وہ بات اُس میں موجود ہو، یہی تو غیبت ہے۔ اگر وہ بات اُس میں نہیں پائی جاتی تو یہ بہتان ہے''۔ ایک اور حدیث مبارکہ ہے: عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ وَلَاتَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَاتَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًاo (بخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم دوسروں کے متعلق بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم کسی کی کمزوریوں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور جاسوسوں کی طرح رازدارانہ طریقے سے کسی کے عیب معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کیا کرو اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بیجا ہوس کرو، نہ آپس میں حسد کرو، نہ بغض و کینہ رکھو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، بلکہ اے اللہ کے بندو! اللہ کے حکم کے مطابق بھائی بھائی بن کر رہو"۔

ایک اور موقع پر آپﷺ نے صحابہؓ سے پوچھا کہ سب سے بڑا مسکین کون ہے۔ صحابہؓ نے فرمایا کہ یا رسولﷺ ہمارے نزدیک مسکین وہ ہے جس کے پاس مال و دولت کی قلّت ہو۔ آپﷺ نے فرمایا کہ مسکین یہ نہیں بلکہ مسکین وہ ہے جو قیامت کے دن نیکیوں کے انبار لے کر اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہو گا اور وہاں اُس سے لوگ اپنے غصب شدہ حقوق کا مطالبہ کریں گے۔ ایک شخص کہے گا کہ مجھے اس نے گالی دی، دوسرا کہے گا اس نے میرا ناحق مال دبایا ہے، تیسرا کہے گا اس نے نا حق مجھ پر تہمت لگائی۔ اللہ تعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ اس شخص کی تمام نیکیاں ان لوگوں کے حقوق کے بدلے اِن کو دی جائیں اگر پھر بھی ان کے حقوق ادا نہ ہوں تو اِن کے گناہ اس شخص پر ڈالے جائیں۔ آپﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اس شخص سے زیادہ مسکین کوئی نہیں ہو گا۔ (کہ جو شخص تھوڑی دیر پہلے بے شمار نیکیوں کے ساتھ کھڑا تھا اب گناہوں کے بوجھ تلے دب کے رہ گیا ہے)۔ ہمارے اکثر لوگ غیبت تو کُجا بہتان کی حدود کو بھی عبور کر جاتے ہیں۔ دوسروں کی برائی یا کمزوری بیان کرنا نہایت ہی پسندیدہ مشغلہ سمجھا جاتا ہے۔ آج

کل سیاست اور فرقہ واریت تو اپنی اچھائیوں کے مقابلے میں دوسروں کی برائیاں بیان کرنے کا نام ہے۔ مذہبی طور پر بھی اپنے مسلک کی اچھائیوں کا علم تو روز بروز کم ہو رہا ہے جبکہ دوسرے مسالک کی کمزوریاں بیان کرنے میں مہارت کا نام ہی مذہب اور عقیدہ رکھ دیا گیا ہے۔ دوسرے ممالک کا تو علم نہیں مگر اپنے ہاں تو سارا معاشرہ اس لعنت میں گرفتار ہے۔ سوائے ان چند حضرات کے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و بصیرت عطا کر رکھی ہو۔ غیبت کی وضاحت کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کا ایک واقعہ تاریخی کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ کسی معاملہ میں امام صاحبؒ کا ایک مجوسی سے تکرار ہو گیا، اس نے آپؒ کو گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ آپؒ اُس کی گالیاں سنتے گئے اور اپنے گھر کی طرف چلتے گئے۔ دریں اثنا آپؒ گھر پہنچ گئے اور دروازے کے پاس ہی کھڑے ہو گئے اور اس شخص کو ایک عالمانہ جواب دیا۔ فرمایا ''اے شخص ! اپنی زبان کو خوب لمبا کر کے مجھے گالیاں دے لے۔ میں چاہتا ہوں کہ تجھے ایک ہی قسم کا گناہ ہو۔ میں گھر میں داخل ہو جاؤں گا تو تمہیں دوہرا گناہ ہو گا۔ ایک گالیوں کا اور دوسرا غیبت کا''۔ حضرت امام حسن بصریؒ سے ایک واقعہ منسوب ہے کہ آپؒ سے ایک ہمدرد دوست نے آپؒ کے دشمنوں کی شکایت کی۔ آپؒ خاموشی سے سنتے رہے۔ وہ شخص بڑا پریشان ہوا کہ آپؒ نے اس شکایت پر کوئی تبصرہ نہیں فرمایا۔ آپؒ نے اُس کے اضطراب کو بھانپ لیا اور فرمایا کہ ''میں اپنے دشمنوں سے اس قدر ہمدردی نہیں برت سکتا کہ اُن کی غیبت کر کے اُن کے گناہ اپنے سر لوں اور اپنی نیکیاں ان کے کھاتے میں ڈال دوں''۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ تاریخی کتب میں معروف ہے کہ آپؓ ایک دن رات کو گشت فرما رہے تھے۔ دورانِ گشت آپؓ کو ایک مکان میں چراغ روشن نظر آیا جب کہ انہی ایام میں آپؓ نے رات کو چراغ بجھائے رکھنے کے احکامات صادر

فرمائے تھے۔ آپؓ نے اُس مکان کی دیوار پر چڑھ کر اندر جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ لوگ اندر شراب نوشی میں مصروف ہیں۔ دوسرے دن صبح آپؓ نے اُن کو اپنے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور رات کے واقعے کے متعلق پوچھا۔ اُنھوں نے کہا کہ آپؓ کو کیسے معلوم ہوا؟ اس پر آپؓ نے فرمایا کہ میں نے آپ کو خود دیکھا۔ اس پر برجستہ ان لوگوں نے کہا کہ ہم نے ایک گناہ کیا اور آپؓ نے دو گناہ کیئے۔ ایک گناہ تجسّس کا اور دوسرا مکان کے اندر جھانکنے کا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی ذاتی اور نجی زندگی میں ٹوہ لگانے سے منع فرمایا گیا ہے۔

۲۶: وقت کی قدر

اچھے حکمران کے لیئے نا گزیر ضرورت ہے کہ وقت کو ضائع ہونے سے بچائے۔ وقت کی تقسیم درست کرے کیوں کہ وقت سب سے بیش قیمت دولت ہے جو ضائع ہونے کے بعد واپس نہیں لائی جا سکتی۔ اور یہ ضرورت صرف حکمران کے اپنے وقت کو بچانے کی نہیں بلکہ تمام عمال حکومت کے وقت کو بچانے کا اہتمام کرنے کی ہے۔ اس کے لیئے نہایت حکیمانہ طریقہ یہ ہے کہ حکمران خود کم سے کم بولے اور دوسروں کی رائے سُن کر اس پر مختصر رائے یا فیصلہ دے۔ اس پر سرکار دو عالم ﷺ کا فرمان مبارک کامل رہنمائی کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا : ''خَیْرُالْکَلَامِ مَا قَلَّ وَ دَلَّ'' ''بہترین بات وہ ہے جو مختصر اور جامع ہو''۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حکمران کسی بھی میٹنگ یا مجلس میں مقررہ وقت پر پابندی سے پہنچے۔ اس سے ایک تو ساری ریاستی مشینری میں خود بخود وقت کی پابندی کرنے کا رواج پیدا ہو جائے گا اور کسی اضافی مشقت یا کوشش کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی، دوسرا یہ کہ حکمران کے تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے سرکاری حکام اور دیگر لوگوں

کا وقت انتظار کرنے میں ضائع نہیں ہو گا۔ حکمران کو کسی محفل یا میٹنگ میں ہر بات کا جواب دینا یا اپنے تاثرات ظاہر کرنا قطعاً ضروری نہیں بلکہ صرف نہایت اہم اور ضروری باتوں پر ہی رائے کا اظہار کافی ہے۔ نیز حکمران کے لیئے ہر بات کا ترکی بہ ترکی جواب دینا تو سرے سے غیر ضروری بات اور وقت کا ضیاع ہے۔ یہ بات بجائے خود اہمیت رکھتی ہے کہ زیادہ بولنے سے سوچنے اور غور کرنے کا وقت کم ہو جاتا ہے اور دماغی صلاحیت جو سوچ و فکر اور غور و خوض پر صرف ہونی چاہیئے،وہ بے جا بولنے میں صرف ہوتی ہے۔

۲۷: رسائی

ہمارے معاشرے میں بالعموم اور ایک اسلامی معاشرے میں بالخصوص خود کو عوام کے لیئے قابل رسائی بنانا اچھے حکمران کے لیئے ضروری ہے۔ اس سے ایک تو خوشامدی اور چاپلوس طبقہ کے ذریعے ملنے والی یکطرفہ معلومات کی تصحیح ہوتی رہتی ہے، دوسرے یہ کہ لوگ حکمران سے پیار و محبت کا رشتہ استوار کرتے اور برقرار رکھتے ہیں۔ لینا دینا اتنا اہم اور ضروری نہیں جتنا یہ احساس کہ حکمران سے آسانی سے ملاقات کی جا سکتی ہے۔ اس رسائی کے لیئے قابل عمل نظام وضع کرنا بجائے خود ایک ضروری امر ہے۔ لازمی نہیں کہ حکمران ہر شخص کے لیئے ہر وقت ملاقات کے لیئے موجود ہو اور یہ عملاً ممکن بھی نہیں لیکن اس کا اہتمام ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص ملنا چاہے تو اسے بہت زیادہ دِقت اور پریشانی نہ ہو اور نہ وہ غیریت محسوس کرے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ حکمران اپنے روزانہ کے معمولات میں ایک مناسب وقت عام ملاقات کے لیئے مختص کرے جس میں لوگوں کو بالمشافہ ملے اور ان کی بات سنے۔ یہ اہتمام سفر و حضر اور دورہ و قیام کے دوران بھی کیا جا سکتا

ہے۔ اپنے ساتھیوں اور ذمہ دار لوگوں کے ساتھ تسلسل کے ساتھ رابطہ و ملاقات اور بھی ضروری ہے۔ اس کے لیئے بھی اہتمام کیا جانا چاہیئے کہ ایسے لوگ مناسب وقت پر بلا تردّد ملاقات کر سکیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ایک حکمران کے وزراً میرے پاس شکایت لے کر آتے تھے کہ اُن کی کئی مہینوں سے خود اپنے سربراہ سے ملاقات نہیں ہو رہی اور بسا اوقات میرے کہنے پر ان کو ملاقات کا وقت ملتا تھا۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک مرتبہ یمن کے یہودیوں کا ایک وفد حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا اور انھوں نے شکایت کی کہ ہم جب یمن کی سرحد سے مدینہ میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کی انتظامیہ ہم سے سامان تجارت پر ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اسی طرح جب ہم بچا ہوا سامان لے کر واپس جاتے ہیں تو اسی مال پر ہم سے دوبارہ ٹیکس لیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب یہ شکایت سنی تو اُن کے چہرے پر غصّے کے آثار دیکھ کر یہودیوں نے محسوس کیا کہ شاید ہماری شکایت پر حضرت عمرؓ ناراض ہو رہے ہیں۔ لیکن جب یہودی تیزی کے ساتھ نکل کر واپس گئے اور سرحد پر پہنچے تو وہاں کی انتظامیہ نے کہا کہ خلیفہ کا حکم آ گیا ہے اور ہم تم لوگوں سے ٹیکس نہیں لیتے۔ نہ کوئی ٹیلیفون تھا، نہ تار نہ کوئی اور مادی سبب جو اس قافلے کی واپسی سے پہلے خلیفہ کا حکم پہنچا دیتا۔ لیکن تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ میں نے خود اس بات کا بار ہا تجربہ کیا ہے کہ کمزور آدمی کی شکایت پر کوئی توجہ نہیں دیتا ہے اور نہ اس کی اعلیٰ سطح پر رسائی ہوتی ہے۔ شکایت جھوٹی ہو یا سچی چھان بین ضروری ہے۔ اگر انتظامیہ کے آفیسران کو یقین ہو کہ ہمارے خلاف شکایت سنی جائے گی تو اس سے خود بخود بدعنوانی اور رشوت ستانی بند ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ کمزور آدمی کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ حالانکہ اسلامی نظام حکومت

میں جو آدمی کمزور ہے وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے اور جو طاقتور ہے وہ سب سے زیادہ کمزور ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اہمیت عوام الناس کو ہے نہ کہ خواص کو۔ میرے اپنے ذاتی کئی تجربات و مشاہدات ہیں اس لیئے میں یہ بات لکھ رہا ہوں۔ چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی شکایت کو سننا چاہیئے۔ ایک دفعہ چناری (مظفرآباد) کے مقام پر ایک میٹنگ کے دوران ایک شخص بار بار میری طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انتظامیہ والے اس کو آنے سے روک رہے تھے۔ میں نے انتظامیہ کو کہا کہ اس کو آنے دیں۔ وہ آدمی میرے پاس آیا اور درخواست پیش کی جس پر میں نے کہا کہ تھوڑی دیر بعد آنا۔ کچھ دیر بعد پھر وہ شخص آیا اور دوران میٹنگ اپنی بات منوانے پر اصرار کر رہا تھا تو میں نے کہا کہ جاؤ جہنم میں تو اُس شخص نے کہا کہ جہنم میں آپ جائیں۔ ہم نے تو آپ کو ووٹ دیئے ہوئے ہیں اور آپ ہیں کہ بات ہی نہیں سنتے۔ میں نے اس کی بات کا بُرا نہیں مانا اور انتظامیہ کو بھی منع کیا کہ اسے کچھ نہ کہیں۔

حکمران میں ہر تلخ بات سننے کا حوصلہ ہونا چاہیئے اور ساتھیوں کی تلخ ترش باتوں کو بھی خندہ پیشانی سے سُننا حکمران کی ذمہ داری میں شامل ہے ورنہ لوگ سچی بات کرنے میں جھجک اور حجاب محسوس کریں گے اور نتیجتاً حکمران صحیح معلومات سے محروم ہوتا چلا جائے گا۔

ایک بڑی سنگین خرابی جو میں روزمرّہ دیکھتا ہوں وہ کسی سائل اور خاص طور پر کسی غریب و مسکین کی بات کو قابل توجہ نہ سمجھنا ہے۔ یہ ایسا نقص ہے جس سے کسی کا بھی کیا ہوا اچھے سے اچھا کام بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ کسی بھی اچھی حکومت، حکمران یا حکمرانی کے لیئے یہی ایک بات زہرِ قاتل ہے۔ ایک تو ذمہ داری

کے نقطۂ نظر سے دوسرے اُس خرابی کے ردِّعمل کی وجہ سے۔ ردِّعمل میں لوگوں کی بددعائیں بھی شامل ہیں۔ مظلوم کی بددعا کے بارے میں کسی فارسی شاعر نے کیا خوب کہا۔ ''مظلوموں کی آہ سے ڈرو کہ بددُعا کرتے وقت درحق سے اجابت استقبال کرتی ہے''۔ دیکھیئے کہ سائل کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے کتنا واضح طور پر فرمایا کہ ''وَاَمَّـا السَّـآئِـلَ فَلَا تَنْهَـرْ'' ترجمہ: ''اور سوال کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کر''۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں اس بات کی کوئی تخصیص نہیں کی کہ اُس کا مذہب کیا ہے اور وہ امیر ہے یا غریب۔ مطلق حکم فرمایا کہ سائل کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کر۔ واضح مطلب یہ ہے کہ اُس کے سوال کا مثبت جواب دیا جائے نہ کہ ڈانٹ ڈپٹ کر کے اُس کو رَد کیا جائے۔ بعض لوگ کسی سائل کو چند ٹکے دیتے ہوئے ہچکچانے کے علاوہ اعتراضات کرتے ہیں کہ یہ پیشہ ور لوگ ہیں۔ میں نے کئی لوگوں کو اس کے جواب میں وہ واقعہ سنایا کہ نبیﷺ کے ایک صحابیؓ جو امیر شخص تھے جب مسجد نبوی شریف میں جاتے تو مسکینوں کو پیسے دیتے۔ ایک صحابیؓ نے اُن سے کہا کہ یہ تو مسکین ہی نہیں ہیں۔ اس بات کے جواب میں نبیﷺ کے اس صحابیؓ نے جو فرمایا وہ قابل غور ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے نام پر بار بار دھوکہ دیا جائے سبحان اللّٰہ وبحمدہٖ۔

اس سے بھی بڑھ کر دیکھیئے کہ خود فخرِ موجودات سرورِ کائناتﷺ نے اس بارے میں کیا کیا۔ حدیث مبارکہ میں وہ واقعہ معروف ہے کہ قریش خاندان کے کچھ سرکردہ حضرات کو دعوت دینے کے لیئے آپﷺ مسجد نبوی شریف کی طرف تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک بڑھیا جو غالباً قریش میں سے نہیں تھی اس نے نبیﷺ کے ساتھ علیحدگی میں بات کرنا چاہی۔ نبیﷺ قریش کے

سرداروں سے کچھ فاصلے پر بُوڑھی خاتون کی بات سننے تشریف لے گئے اور کافی دیر تک اس کی باتیں سنتے رہے۔ بعض کہتے ہیں کہ تقریباً ایک گھنٹہ کے لگ بھگ وہ بات کرتی رہی اور نبیﷺ سُنتے رہے۔ اس کے بعد آپﷺ قریشی سرداروں کے ساتھ مسجد نبوی شریف میں تشریف لے گئے اور ان کو اسلام کی دعوت دینا چاہی۔ اُن لوگوں نے آپﷺ سے کہا کہ وہ تو پہلے ہی اسلام لا چکے ہیں اور وجہ بتائی کہ اُس غریب عورت کی بات سوائے ایک نبی کے اتنی دیر تک کوئی بھی نہیں سُن سکتا تھا۔ ہمارے بھائی جنھیں اللہ پاک نے عزّت دی، حکومت دی یا ثروت عطا کی وہ اس بات پر غور کریں اور پھر اپنے کردار کا موازنہ کریں کہ اُن کے نزدیک کسی غریب سائل کی کیا حیثیت ہے۔ جب تک رشتہ دار یا ووٹر نہ ہو یا اُس سے کوئی مطلب نہ ہو تو کیا ہمارے معاشرے میں اس قسم کے غریب کی کوئی گنجائش ہے؟ الا ماشاٗ اللہ۔ میں کئی بار اپنے بیٹے عتیق احمد خان سے کہتا رہتا ہوں کہ زیادہ توجہ سے بات اُس کی سننا چاہیئے جسے آپ سے کوئی مطلب نہ ہو نہ کہ اُس کی بات پر وقت ضائع کریں جس سے آپ کو مطلب ہے۔ میں جب یہ باتیں کہتا یا لکھتا ہوں تو میرا ضمیر مجھے پوچھتا ہے کہ کیا تم خود بھی اس پر عمل کرتے ہو؟ اس کا جواب ایک تو وہ ہے جو میں دیتا ہوں کہ الحمد لِلّٰہ یہ بات پوری طرح میرے دل و دماغ میں راسخ ہے۔ دوسرا جواب میرے ساتھ کسی بھی حیثیت میں تعلق رکھنے والے لوگ دے سکتے ہیں کہ کیا میں اپنے بارے میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ بات میں اس لیئے کہہ رہا ہوں کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ کوئی ناممکن امر ہے۔

جس طرح یہ کام انفرادی طور پر کرنا ضروری ہے اس سے بڑھ کر حکمرانوں کی یہ سب سے اہم ذمہ داری ہے۔ غیر مسلم دنیا میں خاص کر مغربی ممالک میں ہر

شخص کی اپنی ایک حیثیت ہے جس کا وہ اعتراف کرتے ہیں مگر مسلم ممالک میں اس پر توجہ یا تو کم ہے یا ہے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم انفرادی طور پر اور سرکاری طور پر بھی انسانوں کی خدمت کر سکیں اور اللہ اور رسول ﷺ کے اُس فرمان سے استفادہ کر سکیں جو انسانوں کے لیئے مفید ہونے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اور پھر اسی کی تائید میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اسی سے متعلقہ یہ بات جو کہ میرے تجربہ میں بھی ہے کہ کسی غریب اور متوسط درجے والے سائل کی بات کو اگر غور اور توجہ سے سُن ہی لیا جائے تو بہت حد تک سائل کو اطمینان ہو جاتا ہے۔ بڑی پریشانی اس سے ہوتی ہے کہ متوسط درجے کے لوگوں کی بات سنی نہیں جاتی جب کہ وہی اس ملک کی اکثریت بلکہ اساس ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض حضرات اگر ایسے کسی آدمی کی بات سُن بھی لیں تو ٹال مٹول کر دیتے ہیں۔ اب اچھی یا بُری حکمرانی کا معیار کس طرح قائم ہو گا۔ لوگوں کو جو کچھ ملنا ہے کیا وہ احسان کے طور پر، اُن کو پریشان کر کے، رشوت لے کر، کسی بڑے کی سفارش کروا کے، کسی بڑی رشتہ داری کا واسطہ دے کر یا حق کے طور ملے گا۔ اگر دودھ و شہد کی نہریں چلا دیں مگر ایک مجبور شخص کی بات نہیں سُنی اور اس کا ازالہ نہیں کیا تو بھاڑ میں جائے ایسی حکمرانی۔ اُس شخص کو تو نہروں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہو گی بلکہ وہ دل ہی دل میں بددعا کر رہا ہو گا، شکایت کر رہا ہو گا اور اس سے بھی بڑھ کر مایوسی کا شکار ہو رہا ہو گا جس کے نتیجہ میں ملک کے ساتھ اس کی وابستگی اور محبت کمزور ہو گی اور یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے وطن کی محبت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے حکمران اگر اتنا ہی کر دیں تو یہ وطن جنت بن سکتا ہے۔ اس کو اللہ پاک نے زندہ رہنے کی قدرتی صلاحیت سے نوازا ہے۔ بات وہی علامہ صاحبؒ والی ہے:

؎ نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

۲۸: عزّتِ نفس

ساتھیوں اور کارکنوں کی عزت نفس کا خیال رکھنا اور اسے مجروح ہونے سے بچانا اچھے حکمران کے اوصاف میں شامل ہے۔ انسان کیسا بھی ہو اس میں عزّت نفس کا احساس بلا امتیاز اور یکساں ہوتا ہے۔ تکبّر والا شخص ہی دوسروں کی عزّتِ نفس کی پرواہ نہیں کرتا۔ لوگوں کو اپنے کسی کام کے ہو جانے کا شاید اتنا اطمینان اور خوشی نہیں ہوتی جتنا ان کو عزت و احترام سے پیش آنے پر ہوتی ہے۔ عزّتِ نفس برقرار رکھنے کے لیئے ضروری ہے کہ کسی شخص کی کسی محفل میں دل آزاری نہ کی جائے اور نہ ایسی بات کی جائے جو عزت نفس مجروح کرنے کا سبب بنے۔ اولاً تو کسی بات کو مجلس میں نہ جھٹلایا جائے تو بہتر ہے لیکن اگر کسی بات سے اختلاف یا تردید کا اظہار نا گزیر ہو تو دل شکنی یا دل آزاری کیئے بغیر کیا جائے۔ غصے کا اظہار نہ کرنے میں بھی بڑی حکمت ہے لیکن اگر کوئی چارہ نہ ہو تو اظہار میں بھی حکمت سے کام لیا جائے تا کہ کسی کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہو اور اسے غلطی کا احساس بھی ہو جائے۔ آپ ﷺ کا یہ فرمان ہر وقت کامیاب حکمران کے پیش نظر رہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَعِدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمِمْبَرَ فَنَادیٰ بِصَوْتٍ رَفِيْعٍ يَا مَعْشَرَمَنْ اَسْلَمَ بِلِسَانِهٖ وَلَمْ يُفْضِى الْاِيْمَانُ اِلٰى قَلْبِهٖ لَا تُؤْذُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تُعَيِّرُوْهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَا تِهِمْ فَاِنَّهٗ مَن يَّتَّبِعْ عَوْرَةَ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ يَتَّبِعُ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ وَمَن يَّتَّبِعُ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ يَفْضَحْهُ وَلَوْ فِىْ جَوْفِ رَحْلِهٖo (ترمذی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ منبر پر چڑھے اور

آپ ﷺ نے بلند آواز سے پکارا اور فرمایا: اے وہ لوگو جو زبان سے اسلام لائے ہو اور ان کے دلوں میں ابھی ایمان پوری طرح اترا نہیں ہے، (جیسا کہ قرآن کریم میں ہے) مسلمان بندوں کو ستانے سے اور اُن کو عار دلانے اور شرمندہ کرنے اور اُن کے چھپے ہوئے عیبوں کے پیچھے پڑنے سے باز رہو، کیونکہ اللہ کا قانون ہے کہ جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کے چھپے عیبوں کے پیچھے پڑے گا اور اس کو رسوا کرنا چاہے گا، تو اللہ تعالیٰ اُس کے عیوب کے پیچھے پڑے گا اور جس کے عیوب کے پیچھے اللہ تعالیٰ پڑے گا، وہ اس کو ضرور رسوا کرے گا (اور وہ رسوا ہو کے رہے گا) اگرچہ اپنے گھر کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔

۲۹: سادگی

اچھے حکمران کو طور و اطوار اور بود وباش میں سادگی کا ایسا وتیرہ اپنانا چاہیئے جو کہ ایک عام شخص کی طرزِ زندگی کے مطابق ہو۔ اس کا یہ عمل نجی اور اجتماعی زندگی دونوں میں یکساں ہونا چاہیئے۔ کامیاب حکمران کے لیئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی گفتگو آسان اور دل نشیں انداز میں ہو تاکہ سامعین پر گراں نہ گزرے۔ آپ ﷺ کے متعلق صحابہؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی گفتگو کے الفاظ کو اگر ہم گننا چاہتے تو گن سکتے تھے۔ آپ ﷺ ہر جملے کو تین بار دھراتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کَلِّمُ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ o ترجمہ: ''لوگوں سے گفتگو ان کی علمی استعداد کے مطابق کرو''۔ گفتگو کے دوران حفظِ مراتب کا خیال رکھے۔

۳۰: محنت اور وابستگی

محنت اور وابستگی کے بارے میں تمام اہل علم وعقل نے اس بات پر اتفاق

کیا ہے کہ محنت کسی بھی سطح پر اور کسی بھی نوعیت کی ہو وہ اپنا اثر ضرور ظاہر کرتی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے اندر ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَایُغَیِّرُمَابِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْامَابِاَنْفُسِھِمْ۔(القران) ترجمہ: ''کسی قوم کی حالت اللہ تعالیٰ نہیں بدلتے جب تک وہ خود اس کو نہ بدلیں''۔ بقول علامہ محمد اقبالؒ،

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہوجس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اللہ تعالیٰ کے پیارے حبیبﷺ نے فرمایا: ''اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہ''ترجمہ: ''محنت کرنے والا اللہ تعالیٰ کا دوست ہے''۔ محنت کرنے والا کسی بھی طبقہ، مذہب، زبان اور ملک کا ہو وہ اللہ تعالیٰ کا دوست ہے۔ اس ضمن میں ایک اور حدیث مبارک ہے کہ ''رسولﷺ سفر میں تشریف لے جا رہے تھے تو راستے میں کٹا ہوا ہاتھ پڑا تھا۔ آپﷺ نے اُس کو اٹھایا اور چوما۔ صحابہؓ نے تعجب سے پوچھا کہ یا رسولﷺ ممکن ہے یہ کسی کافر کا ہاتھ ہو۔ آپﷺ نے فرمایا کسی کا بھی ہاتھ ہو اس ہاتھ پر میں نے محنت کے نشانات دیکھے ہیں۔ اس لیئے مجھے یہ ہاتھ اچھا لگا''۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ: ''حضرت فاطمہؓ آپﷺ کے پاس حاضر ہوئیں اور کہا پیارے ابا جان! چکی پیس پیس کر اور آٹا گوندھ گوندھ کر میرے ہاتھوں پر گہرے نشان پڑ گئے ہیں۔ بدر کے قیدیوں میں سے مجھے بھی خادم عنایت فرمایا جائے تاکہ گھریلو کام کاج میں سہولت ہو۔ آپﷺ نے فرمایا کہ فاطمہؓ! محنت اور مشقّت اٹھانا بہت بہتر ہے اس بات سے کہ آدمی کا بوجھ کوئی دوسرا اٹھائے''۔ محنت کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے: وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ ترجمہ: ''اور انسان وہی کچھ پاتا ہے جس کے بقدر وہ محنت کرتا ہے''۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے محنت کو ہر شخص پر فرض کر دیا۔ اس کو

قرآن نے اس طرح بھی ذکر کیا ہے کہ: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِی النَّاسِ ۔ ترجمہ: ''پانی اور خشکی میں جو فساد ہے وہ سب لوگوں کے ہاتھوں ہی کا کیا دھرا ہے''۔ اس آیت سے بھی محنت کا ہی پتا چلتا ہے اگرچہ غلط عمل کی وجہ سے غلط نتیجہ ہی نکلتا ہے لیکن غلط عمل بھی ایک عمل تو بہرحال ہے۔ اس لیئے قرآن کریم نے صحیح اور غلط کے مابین بھی تخصیص کر دی۔ مصیبتوں اور پریشانیوں کو بھی قرآن نے ہاتھوں کا کسب کہا ہے۔ فرمایا: وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ۔ ترجمہ: ''اور جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ سب تمہارے ہاتھوں کا کیا دھرا ہے''۔ اس آیت مبارکہ سے صاف ظاہر ہے کہ محنت کسی بھی نوعیت کی ہو اللہ تعالیٰ اس کے اثرات کو ضائع نہیں فرماتے۔ جو بُرا عمل کرے گا اس کی جزا پائے گا اور جو صحیح عمل کرے گا وہ عزت کا مستحق ہو گا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسُ فَيَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ ۔ ترجمہ: ''اور جو لوگ انسانوں کے لیئے فائدہ مند ہیں وہی زمین پر باقی رہیں گے''۔ یعنی اگر فساد کے لیئے محنت کریں گے تو درج بالا آیات کے مطابق فساد پیدا کریں گے اور اگر انسانوں کے لیئے مفید کام پر محنت کریں گے تو زمین پر باقی رہیں گے۔ اسی ضمن میں ایک اور حدیث مبارکہ بھی ہے کہ: ''خَيْرُالنَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسِ ۔ ترجمہ: ''لوگوں میں بہتر وہ ہے جو انسانوں کے لیئے فائدہ مند ہے''۔ مولانا حالی نے محنت کے بارے میں فرمایا:

؎ جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ
وہ پاتے ہیں دنیا میں عزت زیادہ

تو گویا اس طرح محض محنت مقصود نہیں ہے۔ چوری کرنے میں جو محنت کرنا

پڑتی ہے وہ شاید اچھا کام کرنے والے سے زیادہ ہو مگر ظاہر ہے کہ اس کے لیئے اچھے انعام کا وعدہ نہیں ہے۔

حضرت قائد اعظمؒ نے پاکستان بننے پر قوم سے خطاب میں کہا تھا کہ: ''کام، کام اور بس کام'' جب کہ آج ہم اسی کام سے جی چراتے ہیں اور گویا قائد اعظم کو جواباً کہہ رہے ہیں ''بے کاری، بے کاری اور بے کاری''۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لگن، وابستگی اور شوق کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ کام اگر شوق سے نہیں کرے گا تو وہ بے نتیجہ رہے گا اور اگر شوق سے کرے گا تو وابستگی کا مطلب خودبخود ظاہر کر دے گا۔ اسی طرح وابستگی ہو گی تو لازماً شوق کی وجہ سے ہی ہو گی۔ اگر کسی ایک مزدور کو شوق سے کام کرتے دیکھیں تو ہر شخص اس کی تعریف کرتا ہے ۔اور اس مزدور کی اس کام کے ساتھ وابستگی خودبخود ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت میں وابستگی ہی محنت کا باعث ہے اور وابستگی ہی انسان کو تشخص عطا کرتی ہے۔ ہمارے لوگ ملک سے باہر جا کر تو خوب محنت کرتے ہیں لیکن وہی لوگ جب وطن واپس آتے ہیں تو ہاتھ کو حرکت دینا معیوب فعل ہوجاتا ہے۔ اس کی وجہ بھی وہی وابستگی میں کمی ہے۔ وابستگی نہ ہو تو تمام محنت رائیگاں چلی جاتی ہے اور آدمی کا تشخص بھی بن نہیں پاتا۔ نہ وہ مُردوں میں رہتا ہے نہ زندوں میں۔ آج وابستگی کی کمی کے باعث ہی ہمارا کوئی تشخص بھی نہیں بن پاتا۔ بلکہ باہر جا کر خود کو پاکستانی کہتے ہوئے بھی ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی ہمیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وابستگی جس عمل و فکر کے ساتھ ہو گی تشخص بھی اسی طرز کا ہو گا۔ میں پہلی بار انگلینڈ جانے لگا تو ایک بڑے پڑھے لکھے صاحب نے نصیحت کی کہ وہاں جا کر کسی انگریز کو ناراض نہ کروں۔ میں نے جواباً کہا کہ میں اگر کسی ایک انگریز کو بھی ناراض کر دوں تو یہ

میری سعادت ہو گی۔ وہ مدت تک مجھ سے اس بات پر ناراض رہے۔ یہ بات انسان کے اپنے بس میں ہے کہ وہ اپنا تشخص ایک بے عقیدہ جانور کی طرح کا چاہتا ہے یا اعلیٰ انسانی اصولوں میں سے کسی پر عمل کر کے اپنا تشخص قائم رکھتا ہے اور پھر اس میں محنت کے ذریعہ امتیاز حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا تشخص قائم رکھنے کی سعادت سے نوازے۔

کسی بھی چیز میں کمال حاصل کرنے کے لیئے محنت شرط ہے۔ اسی لیئے جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا، کوشش و محنت کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے۔ ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی معاشی تنگی کا ذکر کیا۔ شاید اُس کا یہ خیال تھا کہ آپ ﷺ مجھے مالِ غنیمت سے دلوا دیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تیرے پاس کوئی نقد یا جنس ہے۔ اُس نے کہا یا نبی ﷺ میرے پاس ایک کمبل ہے، ایک پیالہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ وہ لے آؤ۔ وہ شخص گیا اور لے آیا۔ آپ ﷺ نے ان چیزوں کو صحابہؓ کے درمیان فروخت فرما دیا۔ اس کے بدلے دس درہم اُس شخص کو دے دیئے اور فرمایا جاؤ ایک کلہاڑی اور اس کا دستہ و رسی خرید کر لاؤ۔ وہ آدمی گیا اور تینوں چیزیں خرید لایا۔ آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے کلہاڑی کو دستہ لگایا اور فرمایا جاؤ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر بیچو اور اپنے اہل خانہ کی کفالت کرو۔ محنت کر کے کھانا اس سے بہتر ہے کہ قیامت کے دن تم اللہ تعالیٰ کے حضور اس طرح حاضر ہو کہ تمہارا چہرہ بھیک مانگنے کے سبب داغدار ہو۔ محنت کش فرد ہو یا قوم وہ نہ کبھی محتاج ہوتے ہیں اور نہ ہی زیرِ بار آتے ہیں۔ ہماری محتاجی کی ایک بڑی وجہ بے عملی ہے۔ حاتم طائی نے ایک مرتبہ سو اونٹ ذبح کروایا اور تمام عربوں کو مدعو کیا۔ جب کھانے کی تقسیم شروع ہوئی تو وہ خود جنگل کی

طرف چلا گیا۔ وہاں دیکھا تو ایک ضعیف العمر میاں بیوی جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر گٹھڑی بنا رہے ہیں۔ حاتم طائی نے کہا آپ یہ سب کس کے لیئے کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ محنت مزدوری اس لیئے ضروری ہے تا کہ کسی کے محتاج نہ رہیں۔ حاتم طائی نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آج حاتم طائی نے سو اونٹ ذبح کروائے ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے دو ہاتھ دیئے ہیں وہ حاتم طائی کے کھانے کا انتظار کیوں کرے۔ ہمارے ہاں ہاتھ سے کام کرنا قابل نفرت ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ لوگ اس کو ملامت کرتے ہیں۔ حالانکہ رسول ﷺ نے اپنے سارے کام خود اپنے دست مبارک سے کیئے ہیں۔ محنت کے متعلق منفی رجحانات نے ہمارے قومی مزاج کو تباہ کر دیا ہے۔ تمام قوم راتوں رات امیر بننے کے چکر میں ہے۔ ہر آدمی سہل پسندی کی طرف مائل ہے۔ جب کہ بغیر محنت کے آسائش کا طلب گار ہونا محنت کے ساتھ خیانت کرنے کے مترادف ہے۔

آج ہماری قوم کے بچوں کو اگر ہمارے استاد اپنے ہاتھ سے کام کرنا ہی سکھلادیں تو ہماری آدھی سے زیادہ پریشانیاں دور ہوسکتی ہیں۔ جب کوئی شخص یہ بات سن کر اپنے ہاتھ سے کام کرے گا تب اس کو اس کا فائدہ اور حکمت سمجھ آئے گی۔ میں نے ۱۹۷۱ء میں ایک ابتدائی کوشش کی تھی مگر وہ حکومت سے میرے جانے کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ بھٹو (مرحوم) کے ساتھ بھی اس موضوع پر معاملات طے ہو رہے تھے مگر وہ ظاہر ہے کہ پروان نہ چڑھ سکے۔ میرے خیال میں اب بھی وقت ہے کہ اگر ہم بحیثیت قوم باعزت زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو اس بات سے کوئی مفر نہ سمجھیں۔ ہمارے وزیراعظم سردار عتیق احمد خان نے ہنر مند کشمیر کا جو عندیہ دیا ہے اور کام بھی شروع کروایا ہے یہ وقت کی بے حد اہم ضرورت ہے۔

تاہم میرا خیال ہے کہ اس کام کو جہاں طالب علموں اور نوجوانوں سے شروع کیا جا رہا ہے وہاں اگر اس کا ایک حصہ اوپر والے طبقہ تک پہنچایا جائے تو اس کا اثر بہت جلد ہو گا اور دیر پا ہو گا۔ خود تو اگرچہ ہم نے ۱۹۷۱ء میں اس کام کا آغاز کر دیا تھا لیکن بھٹو صاحب کو بھی میں نے کہا تھا کہ ایک ایسا ادارہ بنائیں جہاں صدر سے نیچے تک تمام بڑے بڑے لوگ باری باری دس پندرہ دن گزاریں۔ وہاں کوئی خادم نہ ہو۔ ہر کام خود کریں تاکہ اس مصنوعی زندگی سے نکل کر صحیح انسانیت معلوم کر سکیں۔ اس کی اس وقت بھی ضرورت ہے۔ اگر بڑے لوگ نہیں کرتے تب بھی چھوٹے لوگوں کو ہاتھ سے کام کرنے میں کیوں توہین معلوم ہوتی ہے۔ کم ازکم اساتذہ، طالب علم، ہمارے وزراء اور دوسرے عہدے دار ہر روز کچھ وقت اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی مشق کریں تو ان کو بلاشبہ چند روز میں ہی اس بات کی عظمت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جو بات فرمائی اور خود اپنے ہاتھ مبارک سے کر کے دکھائی وہ یونہی بے معنی نہیں ہوسکتی۔اس ضمن میں ایک واقعہ معروف ہے کہ ایک رات کو مسجد نبوی شریف میں ایک بدو ٹھہرا۔ رات کو اس کو اسہال آنا شروع ہو گئے اور مسجد کا فرش خراب کر دیا۔ صبح سے پہلے وہ تو ڈر کر بھاگ گیا مگر اللہ کے پیارے حبیب ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اس کا فضلہ صاف فرمایا اور صحابہ کو اس کام سے روک دیا۔ آج ہمارا معا شرہ اتنا مصنوعی ہو گیا ہے کہ کیسے بیان ہو۔ اپنا میل کچیل بھی اپنے ہاتھ سے صاف کرنا دشوار ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ بھاگنا چاہتا تھا مگر چونکہ جوتا پہنانے والا خادم اس وقت موجود نہ تھا اس لیئے وہ نہ بھاگ سکا۔

محنت کی عظمت کو اگر لوٹایا جا سکے تو اس سے زیادہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت

نہیں رہتی۔ اس طرح کا ایک اور واقعہ احادیث کی کتب میں موجود ہے کہ آپ ﷺ ایک مرتبہ سفر سے گھر تشریف لائے اور آپ ﷺ نے دیکھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روٹیاں پکا رہی ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے عائشہؓ کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں چنانچہ آپ ﷺ نے آٹا لیا روٹی بنائی اور آگ پر ڈالی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روٹی کے نیچے آگ جلا رہی تھیں لیکن روٹی پک نہیں رہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے عائشہؓ جس روٹی کو محمد ﷺ کے ہاتھوں نے بنایا ہو اگر سارے جہان کا ایندھن اکٹھا کر کے اس کے نیچے جلا یا جائے تب بھی وہ روٹی نہیں پکے گی۔ یہ تو ایک علیحدہ موضوع ہے۔ بتانا یہ ہے کہ سرکار والا ﷺ نے اپنے سارے کام کاج خود اپنے دست مبارک سے کیئے ہیں۔ اللہ امت کو بھی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔ اس طرح کے کوئی محض چند واقعات نہیں ہیں بلکہ ہزار ہا ایسے واقعات سے نمونے کے طور پر کچھ واقعات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ورنہ عبرت اور پیروی کے لیئے اگر محض کوئی ایک ہی واقعہ ہوتا تب بھی اس پر عمل کرنا اسی طرح ضروری ہوتا۔ ہاتھ سے کام کرنے کے اصول پر کمیونسٹ حضرات نے بہت کچھ کیا لیکن وہ مساوات کی غلط تاویل کے باعث بے نتیجہ ثابت ہوا۔ ایک مسلمان کے لیئے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ خود اللہ پاک نے فرمادیا کہ رسول ﷺ کا طریقہ تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃ'' حَسَنَۃ o
ترجمہ: ''تحقیق رسول اللہ ﷺ کی ذات تمہارے لیئے بہترین نمونہ ہے''۔

۳۱: سرکاری ملازمین اور سیاست

سیاست اور سرکاری ملازمین کا معاملہ بھی خاصا پیچیدہ اور تشویش ناک ہے۔ گو اس سے انکار نہیں کہ ملازمین بھی اسی معاشرے کے افراد ہوتے ہیں اور دانستہ یا

نادانستہ طور پر اُن کا بھی کسی نہ کسی سیاسی جماعت کے لیئے نرم گوشہ رکھنا ایک فطری بات ہے۔ لیکن تجربے میں آیا ہے کہ ملازمین اپنے سرکاری فرائض کی انجام دہی سے بڑھ کر ''شاہ سے زیادہ شاہ پسند'' کے مصداق حکمران کی خوشامد اور چاپلوسی میں سیاست میں زیادہ دم مارنے لگتے ہیں اور وقت کے حکمران کے سامنے سابقہ حکمران کی غیبت کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ اپنے فرائض میں عدل و انصاف سے قطع نظر اپنے ہمنواؤں کو نوازتے ہیں اور حقداروں کا حق مارتے ہیں۔ بعض اوقات اس سے بھی آگے بڑھ کر حکومت وقت کی کوتاہیاں تلاش کر کے اُس کے سیاسی مخالفین کو بتانے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور مخالفین سے وظیفہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ شاباش حاصل کرنے کو اپنی مندی اور ہوشیاری سمجھتے ہیں۔ ایسے حالات میں وقت کے حکمران کو چاہیئے کہ وہ اس قماش کے سرکاری افسران و ملازمین پر کڑی نظر رکھے اور اُن کے اس فعل کی ہر ممکن حوصلہ شکنی کرے تاکہ وہ عوام کے خادم بن کر اپنے فرائض انجام دیں اور سیاست میں ہرگز ٹانگ نہ اڑائیں۔ اُن پر اس بات کو واضح کر دینا حکمران کے لیئے اشد ضروری ہے کہ سرکاری ملازم صرف سرکاری کام کا ذمہ دار ہے اور اُسے حکومت کی طرف سے تفویض شدہ کام تندہی اور دیانت سے انجام دینا ہے اور اپنی سیاسی وابستگی یا ہمدردی کو کسی بھی صورت سرکاری امور کی انجام دہی میں حائل نہیں ہونے دینا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے اور اپنی ذاتی وابستگیوں کو سرکاری ذمہ داری پر حاوی کرے تو یہ نہ صرف آئین اور قانون کی خلاف ورزی ہو گی بلکہ اس حلف کی بھی خلاف ورزی ہو گی جو ملازمت اختیار کرتے وقت اس سے لیا گیا تھا۔ اس قسم کی پارٹی بازی ہماری انتظامیہ کو اندر سے گھُن کی طرح کھا گئی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور قباحت یہ ہے کہ خود ملازمین میں علیحدہ علیحدہ تنظیمیں بنی ہوئی ہیں اور ان تنظیموں کی وفاداریاں بھی کسی اور جگہ ہوتی ہیں۔

اس سے بدنظمی اور افراتفری جنم لیتی ہے اور پھر بددلی، مایوسی اور بے یقینی بڑھتی جاتی ہے۔ انتظامیہ ہو یا سیاسی کارکن سب کو مل کر اس کا علاج سوچنا چاہیئے۔ سیاسی کارکنوں کو چاہیئے کہ ملازمین کو اپنی سیاست میں ملوّث کرنے کے بجائے صرف اپنے بل بوتے پر سیاست کریں اور ملازمین کو چاہیئے کہ وہ عملی سیاست سے اپنا دامن بچا کر رکھیں۔ اگر کچھ بچاؤ ہوسکتا ہے تو اس کا یہی طریقہ ہے۔

اچھی یا بہتر حکمرانی کا موضوع ایسا ہے کہ اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں گہری اصولی باتوں کے علاوہ کچھ علم وہ ہے جسے تجرباتی علم کہتے ہیں اور اس میں فرد سے فرد تک بہت تنوّع ہے۔ حکومت چونکہ کسی ایک شخص کے تجربے کا نام نہیں ہے اس لیئے ہر فرد کا تجربہ مختلف ہو گا۔ تاہم اس کا دارومدار حکومت کے بارے میں اُس شخص کی نیت و ارادے پر ہے۔ حکمرانوں کی تاریخ میں ہر قسم کے افراد ملتے ہیں۔ ظالم، سفاک، خائن، ڈاکو نما، نہایت اچھے اخلاق والے، بااصول، بلکہ مدبرین کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ اس کتاب میں ہر امر کا احاطہ تو ہو نہیں سکتا اور نہ یہ ممکن ہے۔ البتہ میرا خیال اور نیت و ارادہ شروع سے ہی نہایت اچھی حکمرانی کا رہا ہے۔ اس لیئے میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے تجربے کی بنیاد پر جو امور ضروری ہیں وہ لکھے جائیں تاکہ اگر کسی اور کے خیالات بھی وہی ہوں یا اسی طرح کے ہوں تو اس کی رہنمائی بھی ہو اور حوصلہ افزائی بھی۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ اچھائی کی قدروں میں وہ اکیلا ہے یا یہ کہ وہ قدریں ناممکنات میں سے ہیں۔ بلکہ اگر وہ چاہے تو ہمت کر کے اُن پر کسی نہ کسی حد تک عمل بھی کر سکتا ہے۔

تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہمارے ہاں سیاست کا شوق رکھنے والے اکثر حضرات کی سوچ و عمل محض اس حد تک محدود ہے کہ حکومت حاصل کرنا چاہیئے۔ بس اتنا کافی

ہے۔ بعض حضرات کا تو یہ کاروبار ہے اور اس کی حفاظت و تقویت کے لیئے حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض بد بخت حضرات تو مخالفین سے انتقام لینے کے لیئے حکومت چاہتے ہیں۔ بعض بد اخلاقی اور بد کرداری کے لیئے حکومت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگ کم ہی ہیں جو کسی اعلیٰ مقصد اور انسانی خدمت کے جذبے سے حکومت چاہتے ہوں۔ کہنے کو تو سب ہی کہتے ہیں کہ ہم قوم کی خدمت کر رہے ہیں جب کہ اُن کی نیت ہی خدمت کی نہیں ہوتی بلکہ وہ سمجھتے بھی نہیں ہیں کہ خدمت کیا ہے۔ تاہم تاریخ میں اعلیٰ قدروں والے حکمرانوں کے نام بھی مذکور ہیں۔ اسلام میں خلافت راشدہ اعلیٰ مقاصد اور اعلیٰ اصولوں کا نہایت ہی بلند معیار ہے اور شاید آخری بھی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ بھی ایسے حضرات تاریخ میں موجود ہیں جو عدل وانصاف کی اعلیٰ قدروں کی مناسبت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہمارے اس وطنِ عزیز میں تو قائد اعظمؒ کے فوراً بعد سے انتقام کی سیاست شروع ہوگئی اور وہ نہ صرف آج تک چلی آ رہی ہے بلکہ اس کی شدّت میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں ذاتی انتقام سے لے کر قومی سطح پر انتقامی جذبات بہت نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ بلکہ ہماری تمام ملکی و ملّی اور قومی سیاست اُسی ناپاک جذبے کا شکار رہی ہے اور اس وقت تک ملک میں جو استحکام نہیں پیدا ہو سکا تو یہ خالصتاً اسی خبیث جذبے اورسوچ کا نتیجہ ہے۔ اپنے ذاتی تجربے سے میں اس کی کئی مثالیں دے سکتا ہوں۔ بلکہ قائد اعظمؒ کے بعد آنے والے ہر حکمران کے بارے میں بلا تردد ایسے واقعات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ صرف ایک مثال شاید کافی ہو کیونکہ اس جذبے کا جو رقص ابلیس ہے وہ ہر خاص و عام کو اچھی طرح معلوم ہے۔ وہ مثال یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء میں جب سہروردی مرحوم وزیراعظم تھے تو اتفاق سے میں بھی آزادکشمیر کا صدر تھا۔ ان کے ساتھ تھوڑی سی شناسائی پہلے بھی

تھی۔ آزاد کشمیر کے کچھ مالی معاملات کے لیئے میں ان کو ملنے کراچی گیا۔ انھوں نے اس معاملہ میں ایک طرح سے معذرت کی اور مجھے مالیات کی وہ فائل دکھائی جس میں انھوں نے معذرت کی تھی۔ میری زبان سے نکل گیا کہ اس معاملے میں آپ کے پیش رو وزیراعظم چوہدری محمد علی نے کمٹمنٹ کی تھی۔ اس پر وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور میز پر زور سے مُکّا مار کر کہا ''میں یہاں اس لیئے ہوں کہ چوہدری محمد علی نے جو کیا تھا میں اُس کو رد کر دوں''۔ انگریزی میں زیادہ واضح ہو جاتا ہے، سہروردی مرحوم کے اپنے الفاظ تھے:

"I am here to undo what Ch. Muhammad Ali had done". یہ بدنصیب فکر آج تک ہمارے ہاں اپنی پوری خباثت کے ساتھ قائم ہے۔ بلکہ قومی کردار کا حصہ ہے۔ ہمارے حکمرانوں نے اس نظریے کو اپنا دینی فریضہ سمجھا۔ اور کچھ کریں یا نہ کریں مگر دوسروں کو فتح کرنے اور انتقام لینے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ملک میں عدم استحکام اور فکری انتشار بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ کسی ایک کو بھی خدا نے توفیق نہیں دی کہ وہ اپنے انتقامی جذبے کی لعنت کو کچھ عرصہ بالائے طاق رکھے اور وطن عزیز کی بھلائی، بہتری اور استحکام کے لیئے کام کرے۔ یہی حال آزادکشمیر میں بھی رہا ہے۔ البتہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے مجھے توفیق دی اور مجھے اپنی دانست میں کامل یقین ہے کہ میں اس خباثت میں گرفتار نہیں ہوا۔ یہ آخری بات اس لیئے نہیں کہی کہ میں اپنی کوئی خوبی بیان کروں بلکہ اس لیئے کہی ہے کہ جو لوگ اس کو ناممکن سمجھتے ہیں انھیں معلوم ہو کہ یہ عین ممکن ہے۔ البتہ مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ یہ حیوانی جذبہ مشکل سے قابو میں آتا ہے۔ اور اگر آ جائے تو یہ نورٌ علیٰ نور ہے۔ اس لیئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت بلند

معاملہ فرمایا ہے۔

اسی طرح تجربہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ عام طور پر ہر حکمران کے کچھ چہیتے افراد بن جاتے ہیں۔ ایسے خوشامدی، کاروباری اور نالائق لوگوں کی ہر دور میں بہتات رہی ہے۔ ایک حکمران کے لیئے لازم ہے کہ وہ اپنے عزیز و اقارب کی خود غرضیوں کے چُنگل سے بچے۔ ان میں ایک اور طبقہ ہے جو ملازمین سرکار ہیں۔ وہ طبقہ یا اس کے افراد حکمران کو اس طرح شیشے میں اتار لیتے ہیں کہ وہ لوگ سیاہ و سفید جو کرانا چاہیں کرا لیتے ہیں۔ حکمران کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں اور پھر وہ حکمران کی مدد یا خدمت کرنے کے بجائے جی بھر کر اپنی خدمت کرتے ہیں۔ یہی لوگ حکمران کی بدنامی کا ذریعہ بھی بنتے ہیں اور لوگ ان کو ہی حکمران کی ناکامی کا ذمہ دار تصور کرتے رہتے ہیں جو حقیقت بھی ہوتی ہے۔ ستم یہ ہے کہ یہی لوگ دوسرے حکمران کے بھی مصاحب اور چہیتے بن جاتے ہیں جو حسبِ دستور اگلے حکمرانوں کی مخالفت اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ یہ بات عام ہے کہ ایسے لوگ حکمرانوں کے نام پر رشوت کا بازار گرم کر دیتے ہیں اور ان کو کوئی پوچھ نہیں سکتا۔ ان میں ایک طبقہ چغل خوروں کا بھی ہوتا ہے جو دوسروں کے بارے میں جھوٹی چغلیاں کھا کھا کر حکمران کے قریب آنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور عاقبت کو برباد کرتے ہیں۔ باوجود یہ کہ حکمرانوں سمیت اکثر لوگوں بلکہ خود چغل خور کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چغل خور کے لیئے کتنی بڑی سزا کی وعید سنا رکھی ہے۔

ہمارے ہاں ایک لعنت یہ بھی وافر ہے کہ آنے والا حکمران ایسے ہی لوگوں کو تلاش کرتا ہے اور ان ہی پر نوازشات برساتا ہے جو سابقہ حکمران کو بُرا بھلا کہتے

ہوں۔ بلکہ نئے حکمران کے لیئے یہی بات ہمدردی اور عنایت کی علامت بن جاتی ہے۔ میں نے حتی المقدور کوشش کی کہ سابقہ حکمرانوں کی مخالفت کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ بلکہ اللہ نے توفیق دی کہ سیاسی رہنماؤں کے خلاف کارکن ساتھیوں کی مخالفانہ بیان بازی کو بھی روکا۔ یہ بات میں محض اس مضمون کے لیئے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ عمومی طور پر یہ ایک معروف امر ہے۔ ایسا کرنا اگرچہ بہت مشکل کام ہے تاہم یہ عین ممکن ہے اور اس کے دُور رس نتائج بھی ہیں۔

اسی طرح یہ امر بھی حکمرانوں کے لیئے توجہ طلب ہے کہ اکثر و بیشتر حکمران اپنی سوچ وفکر میں اپنی ذات تک محدود ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بہت ہمت کرے تو وہ اپنی برادری، رشتہ داروں اور دوستوں سے باہر نہیں جاتا۔ اگر اتفاقیہ کوئی مزید ہمت کرے تو اس کا انتخابی حلقہ اس کا خدا ہے اور وہ آخری منزل ہے۔

دور بینی اور دور اندیشی، جس کو فراست کہتے ہیں وہ تو محض اتفاقی امر ہے اور خال خال ہے۔ نہ یہ کوئی فنی بات ہے نہ کہیں سے خریدی جا سکتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ بھی ہے۔ مگر اس کا ایک المیہ یہ ہے کہ ایسا شخص انتظامی صلاحیتوں میں کمزور ہوتا ہے۔ اگر غور سے دیکھیں تو اس اصول کا اطلاق نہ صرف دوربین و دوراندیش حکمران یا لیڈر پر ہوتا ہے بلکہ تمام ماہرین فن پر بھی ہوتا ہے خواہ وہ ڈاکٹر ہوں یا سائنسدان، انجنیئر ہوں یا ماہر تعلیم۔الا ماشاء اللہ یہ سب لوگ انتظامی صلاحیتوں میں کمزور ہوتے ہیں۔ حکمران اگر دوربین ہو تو ویسے بھی انتظامیہ اور حکمران کے مابین ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ انتظامیہ تو اس گھوڑے کی طرح ہوتی ہے جس کی آنکھوں پر کھوپے چڑھے ہوتے ہیں وہ صرف ایک ہی طرف دیکھ سکتی ہے۔ جب کہ دوربین شخص ہر طرف دیکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فکر و نظر اس فرق سے

انتظامی امور میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں گھر پر میری نظر بندی کے دوران سردار سکندر حیات صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے اُن سے کہا کہ وہ آئندہ کے لیئے تیاری کریں۔ وہ کچھ کہنے لگے تو میں نے ان کو بتایا کہ میری اور کارکنوں کی سوچ میں کافی فرق آ گیا ہے۔ نہ وہ دوڑ کر مجھ تک پہنچ سکتے ہیں نہ میں پیچھے جا سکتا ہوں۔ آپ درمیان میں پُل کا کام کر سکتے ہیں۔ دوربین حکمران کا ایک المیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ موجودہ انتظامی مشینری کی سوچ اور کام کی رفتار اس حکمران کی سوچ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ اپنی سوچ میں بہت آگے ہوتا ہے جب کہ انتظامیہ اس سے کوسوں پیچھے ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ بھٹو صاحب مرحوم ایک میٹنگ میں پوچھنے لگے ''میری پالیسی میں کیا نقص ہے''۔ میں نے پوچھا ''آپ نے جیٹ ہوائی جہاز دیکھا ہے'' کہنے لگے ''روز دیکھتے ہیں'' میں نے کہا وہ نہیں۔ وہ ''جو دھواں چھوڑتا ہے'' ''کیا مطلب ہے'' انھوں نے پوچھا۔ میں نے کہا ''شروع میں وہ دھواں بہت گہرا ہوتا ہے مگر جوں جوں وہ جہاز آگے جاتا ہے اس کے پیچھے وہ دھواں تحلیل ہو کر ختم ہو جاتا ہے''۔ میں نے کہا کہ آپ کی پالیسی بالکل اس جیٹ کی طرح ہے۔ میرے اپنے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے ایک اعلیٰ افسر کا دماغی توازن ہی بگڑ گیا۔ پھر میں نے اس کو بہت تسلی دی کہ ہم یہ سب کام بند کر دیں گے آپ ٹھیک ہو جائیں۔ دوربین اور دور اندیش حکمران کو اس کا احساس اور شعور ہونا چاہیئے ورنہ شدید تضاد پیدا ہوتا ہے۔ آزادکشمیر کے موجودہ وزیراعظم کے بارے میں بھی اسی قسم کی باتیں آئے دن کی جاتی ہیں۔ از راہِ طنز بھی اور تعجب بھی۔ اس کا ایک ہی مؤثر علاج ہے کہ ہر روز مشورہ کرے۔ خوشامدیوں اور تعریف کرنے والے لوگوں سے نہیں بلکہ تنقید اور نکتہ چینی کرنے والوں کے ساتھ۔ اور اگر زیادہ لوگوں کی رائے مخالف ہو تو اس معاملہ پر عملدرآمد

کو مؤخر کر دے اور اپنی بات کو وقار کا مسئلہ نہ بنائے۔ اس سے کوئی ادنیٰ سا حرج بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ اپنی رائے پر ہی اصرار کرے گا تو کارکنوں اور انتظامیہ کا اعتماد کھو دے گا جو حکومت کے لیئے نہایت ہی خطرناک امر ہے۔ اچھے حکمران اور لیڈر کے لیئے ضروری ہے کہ وہ کارکنوں، انتظامیہ اور عوام تینوں کو ساتھ لے کر چلے۔ ان کو ساتھ چلنے کا حکم نہ دے نہ ان سے توقع رکھے بلکہ خود ان کو ساتھ لے کر چلے خواہ وہ انگلی پکڑ کر ہی چلنے کے مترادف کیوں نہ ہو۔ میں بار بار کہتا ہوں کہ اس تمام عمل میں سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ کسی کی عزّتِ نفس مجروح نہ کرے۔ خواہ وہ شخص کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ غریب اور بے کس کی عزّتِ نفس مجروح کرے گا تو اللہ کو ناراض کرے گا۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں کی عزّتِ نفس مجروح کرے گا تو وہ اس حکمران سے انتقام لیں گے اور اگر وہ انتقام نہ بھی لے سکیں تو دل میں انتقام کی آگ بھڑکاتے رہیں گے۔ بد مزاج حکمران آنے والی نسلوں کے لیئے ایک بُری مثال ہو گا۔

ایک اور توجہ طلب امر یہ ہے کہ حکمران ہو یا کوئی بڑا فرد ، اُن کے اندر ایک جھوٹی انا اس طرح راسخ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس طرح وہ ایک انسانی عظمت سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ ایک غلطی پھر کئی دوسری غلطیوں کو جنم دیتی ہے جس سے سارا معاشرہ ہی عدم استحکام کا شکار ہو جاتا ہے۔ عام طور پر بڑے لوگ اس جھوٹے خیال میں ہوتے ہیں کہ وہ عقلِ کُل ہیں اور اُن سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے اس مشرقی معاشرے میں اس بد نصیبی کا رواج عام ہے۔ بڑے لوگ اپنی غلطی کو تسلیم کرنے میں اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں جب کہ یہ بات انسان کو عظمت عطا کرتی ہے۔

ہمارے ہاں جو سیاسی، جماعتی نظام ہے اس کی جہاں اصولی طور پر کچھ اچھائیاں ہیں وہاں اس کے استعمال میں خرابیاں بھی ہیں اور ان خرابیوں کے باعث یہ نظام خود اس ملک میں عدم استحکام پیدا کر رہا ہے۔ جمہوریت کی تعریف ابراہم لنکن نے اس طرح بیان کی ہے ''عوام کی حکومت، عوام کے لیئے، عوام کے ذریعہ''۔ یہ فکر نہایت ہی عمدہ ہے مگر اس کے لیئے سیاسی کارکنوں اورعوام کا باشعور ہونا ضروری ہے ورنہ یہ اندھوں کے ہاتھ میں دو دھاری تلوار ہے۔ مغرب جہاں جمہوریت پر زور دے رہا ہے تو اس کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ عرصہ دراز تک جدوجہد کرنے کے بعد اس شعور تک پہنچے ہیں جب کہ ہم ابھی اس شعور سے کوسوں دور ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ہمارے ہاں جماعتی نظام نے اس معروف جمہوری اصول کی جگہ یہ اصول اختیار کیا کہ ''پارٹی کی حکومت، پارٹی کے لیئے، پارٹی کے ذریعے''۔ اس سے وہ اصل تصور ہی بدل گیا بلکہ سیاسی پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ نے جنم لیا۔ اُس پر طرہ یہ کہ سیاسی لیڈروں کا مزاج بھی مطلق العنان آمرانہ ہو گیا جو سونے پر سہاگے کا کام کر رہا ہے۔ اگر اصول یہ ہوتا کہ ''جماعتی حکومت، جماعت کے ذریعے اور جماعت کے بجائے عوام کے لیئے'' تب تو یہ صحیح جمہوریت ہوتی اور کسی بھی ملک کے استحکام کا باعث ہوتی جس طرح ترقی یافتہ ممالک میں ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں جماعتی نظام آمریت، بدنظمی، افراتفری اور عدم استحکام کا باعث بن گیا ہے۔ اس طرح کی جماعتی حکومتوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں میں ایک یہ ہے کہ اصحاب اقتدار کی توجہ ایک عام شخص سے ہٹ کر جماعت کے عہدیداروں اور کارکنوں کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جن کے اپنے اپنے مفادات ہوتے ہیں۔ حکمران اُن ہی کو عوامی خیرخواہ اور نمائندے سمجھ کر اُن کی ہر بات پر عمل کرتے ہیں اور عام آدمی حکمران تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی جماعت کے عہدیداران اور

کارکنان پہنچنے دیتے ہیں۔ اس طرح عوام میں حکومت اور حکمران کے خلاف نفرت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے اور جماعت کی جڑیں جو عوام میں ہوتی ہیں کمزور ہوتے ہوتے تنے کو خوراک پہنچانے کے قابل نہیں رہتیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تنا یعنی جماعت بوسیدہ ہو کر ٹوٹ جاتی ہے۔ اکثر اوقات اس تباہی کی بڑی وجہ یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ جماعت کے خیرخواہ حکومت میں چلے جاتے ہیں اور عوام میں دوسرے درجے کے مفاد پرست لوگ رہ جاتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نام نہاد مفاد پرست کارکنوں کی کارستانیوں کے باعث جماعتیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہیں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حکومت ایک تناور اور سایہ دار درخت کی مانند ہوتی ہے اور وہ کسی کو بھی اپنے سائے تلے بیٹھنے سے محروم نہیں کرتی۔ حکومت پر ہر امیر غریب، مخالف، مطابق اور مرد و زن کا برابر حق ہوتا ہے۔ اس ضمن میں برِّصغیر کی سب سے بڑی اور فعال سیاسی جماعتوں مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگرس کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ دنیا میں اس طرح کی اور بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں جماعتیں اپنی انا اور اپنے ہی کارکنوں کی کارستانیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ یہاں بھارتی وزیراعظم آنجہانی اندرا گاندھی کی سیاسی اصلاحات کی یہ مثال درج کرنا خالی از معنی نہ ہو گا کہ انھوں نے جماعت کے اندر پیدا ہونے والی کمزوری اور جماعت سے محبت رکھنے والے کارکنان کے روز بروز ناپید ہونے کے عمل کو دیکھ کر حکم جاری کیا تھا کہ بھارت کے تمام صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اپنے عہدے چھوڑ کر جماعت کے کاموں میں مصروف ہو جائیں۔ چنانچہ تمام وزرائے اعلیٰ نے ایسا ہی کیا۔ گو کہ اندرا گاندھی کے اس اقدام کو ہم نے بغضِ معاویہ کے مصداق بخشی غلام محمد کے خلاف ایک سازش قرار دیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کام اس خاتون کی اعلیٰ سیاسی بصیرت کا عکاس تھا اور پھر جن وزرائے اعلیٰ نے

اپنے عہدے چھوڑے اُن کی سیاسی تربیت اور جماعت سے وابستگی کا ذرا اندازہ کریں کہ اُن کے ہاں جماعت کی قدر و منزلت اقتدار کے مقابلے میں کتنی مقدم اور اہم تھی۔ اس کے برعکس باقی ممالک اور ہمارے ملک میں یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی کارکن کو ذرا سی بھی سیاسی سوجھ بوجھ حاصل ہو جائے تو وہ اپنی سیاسی جماعت مضبوط بنانے کی بجائے اپنی علیحدہ ڈیڑھ اینٹ کی جماعت بنانے کی ٹھان لیتا ہے۔ اس طرح جماعت کو جو نقصان ہوتا ہے وہ تو کسی نہ کسی موڑ پر جلد یا بدیر پورا ہو ہی جاتا ہے لیکن وہ خود اپنا کیریئر تباہ کر دیتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّمہ ہے کہ اگر کوئی کتنا بھی افلاطون اور جماعت و عوام کا کتنا ہی خیرخواہ کیوں نہ ہوحکومت میں آجانے کے بعد جماعت کا کام نہیں کر سکتا بلکہ جماعت اُس کی محتاج ہو جاتی ہے۔ لہذا جماعت کو ہر لحاظ سے طاقتور اور مؤثر ہونا چاہیئے۔ حکمران پر یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ جماعت کو عوام میں مضبوط رکھے اور صرف عہدیداران و کارکنان پر ہی انحصار نہ کرے کیونکہ ایک تو شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے اور دوسرا انسان کا نفس دونوں ہمیشہ اس سے غلطی کروانے کے درپے رہتے ہیں اور موجودہ دور میں ان دونوں دشمنوں کی چالوں سے اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر کسی بھی شخص کا بچنا بہت مشکل ہے۔ ایسے میں ایک حکمران کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیئے اللہ تعالیٰ کی توفیق طلب کرتے رہنا چاہیئے اور اپنا محاسبہ بھی کرتے رہنا چاہیئے۔

حکمرانوں سے غلطیاں کروانے کا اُن کے مخالفین کے پاس ایک اور حربہ بھی ہوتا ہے جسے عام اصطلاح میں Nuisance Value کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کی بلیک میلنگ ہے جو مخالفین حکمران کی کسی کمزوری کو دیکھ کر اُس کا فائدہ اٹھاتے

ہوئے حکمران سے کئی غلط کام کروا دیتے ہیں اور حکمران اُن کی ہر جائز و ناجائز بات اس لیئے مان لیتا ہے کہ کہیں وہ بھرے بازار اُس کا بھانڈا نہ پھوڑ دیں۔ اس طرح کی بلیک میلنگ جماعت کے اندر کے وہ لوگ جو کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو زیادہ طاقتور بنا لیتے ہیں بھی کرتے ہیں اور اپنی من پسند کرسیاں حاصل کرتے ہیں خواہ وہ ان کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔ اُن کے ایسا کرنے سے کئی مستحقین کے حقوق سلب ہو جاتے ہیں۔ وہ چلّاتے ہیں لیکن حکمران اُن کے لیئے لاکھ ہمدردی رکھنے کے باوجود کچھ نہیں کر سکتا۔ ایسے لوگ ہر ملک اور ہر دور میں موجود رہے ہیں اور یقیناً آج بھی ہیں بلکہ آج زیادہ تعداد میں ہیں۔ اس طرح کی صورت حال میں ایک حکمران تب ہی ایسے عوام کُش لوگوں کے نرغے سے بچ سکتا ہے کہ اُس کا دامن ہر لحاظ سے پاک ہو اور وہ عوام کے لیئے ایک کھُلی کتاب ہو۔ اس طرح کی بلیک میلنگ کے ضمن میں اپنے تجربے کی روشنی میں ایک بات کرنا مناسب ہو گا۔ وہ یہ کہ ۱۹۷۰ء میں ہم اقلیت میں تھے جب کہ مخالفین کی اسمبلی میں اکثریت تھی۔ ایک پٹواری کے تبادلے کی پاداش میں ایک بل پر ہمیں اسمبلی میں شکست ہو گئی۔ تاہم اُس وقت صدارتی نظام حکومت تھا اس لیئے حکومت پر کوئی آنچ نہ آئی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ بلیک میلنگ اس حد تک بڑھ جاتی ہے۔

مغرب بشمول امریکہ میں حکمرانوں کے مخالف یا جماعت کے اندر کے سر پھرے مفاد پرستی یا Nuisance Value کا زیادہ استعمال نہیں کر سکتے کیوں کہ وہاں حکمران لاکھ چاہیں تو بھی رشوت دے کر یا ڈرا دھمکا کر Nuisance Value کے حامل افراد یا اپنی جماعت کے منہ زوروں کے منہ نہیں بند کر سکتے۔ امریکن صدر بل کلنٹن کے سکینڈل کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس کے برعکس مشرق میں

اکثر دیکھا گیا ہے کہ حکمران رشوت دے کر یا ڈرا دھمکا کر مخالف کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ اگرچہ میڈیا کی آزادی نے اب اسے یہاں بھی کچھ حد تک ناممکن بنا دیا ہے۔ یہ وہ مشکلات ہیں جو ایک حکمران کو آئے دن پیش آتی رہتی ہیں جن سے نپٹنے کے لیئے حکمران کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی توفیق طلب کرتے رہنا چاہیئے تاکہ وہ بچا رہے۔

اس تمام قضیئے میں ایک بنیادی مسئلہ جوابدہی کا ہے یعنی کس کی جوابدہی کس کے آگے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی تو کسی شک و شبہ سے بالا تر ہے اگرچہ شاید ہی کوئی شخص خاص کر حکمران حضرات میں سے اس بات کا یقینی طور پر قائل ہو گا۔ زبانی کلامی تو ممکن ہے کہ کچھ حضرات اس بات کو مانتے ہوں مگر دل سے اور عمل سے اس کا اظہار بہت ہی شاذ ہے۔ اس حقیقت کے اظہار کے دو ہی مواقع ہوتے ہیں۔ عیش میں یا طیش میں۔ بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر اس صورت حال کو بہتر واضح کرتا ہے:

؎ ظفرؔ اس کو آدمی نہ جانیئے گا
خواہ کیسا ہو صاحبِ فہم و ذکاء
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

کتنے لوگ ہیں خواہ وہ معروف معنوں میں حکمران ہوں یا محض ایک فرد جو عملاً اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہی بات اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ نے اور زیادہ واضح طور پر ارشاد فرمائی۔ حدیث شریف ہے ''تم میں سے ہر شخص حکمران ہے اور ہر شخص سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا''۔ حکمرانوں کی جوابدہی تو ایک

معروف امر ہے اور اس کے کئی طریقے بھی دریافت کیے گئے ہیں جن میں ایک تو اسمبلیاں وغیرہ ہیں۔ دوسرا طریقہ مسجد نبوی شریف میں ہر شخص کو آزادی تھی کہ وہ خلیفہ سے براہِ راست دریافت کر سکتا تھا۔ البتہ ہر فرد کی جس جوابدہی کا ارشاد نبی ﷺ نے فرمایا ہے وہ ضرور غور طلب ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ ایسا کوئی ہے جو جوابدہی کے اس انفرادی اصول پر عمل تو کیا علم اور یقین بھی رکھتا ہو۔ دنیا میں آج جو فساد ہے خاص کر مسلمانوں میں تو اس کی بڑی وجہ یہی خرابی ہے۔ اگر اس کو پورا کر لیا جائے تو دنیا سے کم از کم نوّے فیصد فساد ختم ہو جائے گا۔

اسی طرح ایک اور امر ہے جو کسی بھی معاشرے کو اندر سے کھوکھلا ہونے سے بچاتا ہے ورنہ معاشرہ ڈھول کی مانند ہے کہ آواز بہت ہے مگر اندر سے کھوکھلا ہے۔ کسی بھی معاشرے کو اندر سے کھوکھلا ہونے سے بچانے کے لیئے جو بنیادی اور نہایت ہی اہم اور مؤثر بات ہے وہ ''مروّت'' ہے۔ مروّت کی اہمیت وہی لوگ جان سکیں گے جو اس پر عمل کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں مروّت کر کے بھی دیکھا ہے اور دوسروں کو مروّت کرتے بھی دیکھا ہے۔ مروّت کے بارے میں ہی کسی نے کہا: ؎ ''با دوستاں تلطف بادشمناں مدارا''۔ دراصل اس سوچ کا مرکزی نقطہ مخالفین ہی نہیں بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی ''مدارا'' کرنا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

؎ مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا
مروّت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

یہ امر بھی معروف ہے کہ مروّت بھی ایک اعلیٰ انسانی قدر ہے اور غالباً یہ بھی

عطیہ خداوندی ہے۔ میں کچھ ایسے حضرات کو جانتا ہوں کہ وہ اپنوں سے بھی مروّت نہیں کر سکتے مخالفوں کی یا دشمنوں کی تو بات ہی کیا۔ مگر میں جس بات کا ذکر کر رہا ہوں وہ ایسے ہے کہ اگر اس پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس شخص کو تو بہرحال جو فائدہ ہونا ہے وہ ہو گا ہی مگر اُس سے ایک پورا معاشرہ مستفید و متاثر ہو گا۔ اگر حسن اتفاق سے کسی بھی درجے کے حکمران کو اس امر کی حقیقت اور افادیت سمجھ آجائے تو وہ معاشرہ جنت کا نقشہ بن سکتا ہے۔ اس کی ایک تاریخی مثال وہ واقعہ ہے جو سلطان صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ کے مابین ہوا۔ دونوں کمانڈر جنگ میں تھے۔ اطلاع ملی کہ رچرڈ بیمار ہو گیا ہے۔ سلطان صلاح الدین حکیم بن کر دشمن کی صفوں میں چلے گئے اور اُس کا علاج کیا اور وہ تندرست ہو گیا۔ یہ صرف ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ اُس دور کے مسلمانوں کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اُن غازی مسلمانوں کی ہم بدنصیب اور نالائق اولاد اپنے ہی گھر میں ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے ہیں اور باہم مروّت کرنے کے لیئے تیار نہیں۔

اسی موضوع سے متعلق ایک اور اہم امر یہ ہے کہ حکمرانی اور سیاست اگرچہ کئی اعتبار سے ایک ہی دکھائی دیتے ہیں تاہم کچھ اعتبار سے فرق بھی ہے۔ حکومت کے جو طریقے رائج رہے ہیں اُن میں ایک تو سیاست دانوں کی حکومت ہے جو بہت معروف ہے۔ اس کے علاوہ ایک حکومت امراء کے ذریعے سے ہے جس کو انگریزی میں (Aristocracy) کہتے ہیں۔ ایک اور طرزِ حکومت ہے جس کو بیوروکریسی (Bureaucracy) یعنی ملازمین کی حکومت کہتے ہیں خواہ وہ فوجی ہو یا سول۔ ماہرین کی حکومت کا بھی تذکرہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ایک طریقہ موروثیت

بھی ہے جس کے آثار بکثرت ملتے ہیں خواہ وہ اپنی صلاحیت کی بنیاد پر ہو یا وراثت کے طور پر۔ تاہم ان سب میں زیادہ معروف اور مؤثر سیاست دانوں کی حکمرانی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس کو حکومت مل جائے وہ سیاست دان بھی ہو جاتا ہے۔ سیاست درحقیقت ایک ملکہ ہے جو پیدائشی ہوتا ہے اور وہی سیاست کا صحیح اہل ہوتا ہے جس میں پیدائشی طور پر سیاست کے جراثیم موجود ہوں۔ یہ جراثیم کسی تربیت یا ترغیب سے پیدا نہیں ہوتے البتہ تربیت سے اُن کو جلا ملتی ہے اور وہ طاقتور ہوتے ہیں۔ روحانیت کی طرح ہی سیاست پیدائشی قدر ہے چاہے تھوڑی ہو یا بہت۔ رسول اللہ ﷺ نے جن حضرات کو حکومت کے لیئے منتخب کیا وہ سب کے سب بلا استثنٰی سیاست دان تھے۔ اسلام سے پہلے بھی اور بعد بھی۔ اگرچہ یہ چند حضرات ہر صفت سے متصف تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ معیاری سیاست دان بھی وہی تھے۔ اگر سیاست علم سیکھنے اور تربیت سے آتی تو دنیا کے تمام بڑے بڑے سائنس دان حکمران ہوتے۔ مگر غالبًا سائنس کا کوئی بھی ماہر حکمران نہیں ہوا۔

اسی طرح روحانیت بھی ایک ایسی قدر ہے جو نہ سیکھنے سے اور نہ تربیت سے آتی ہے۔ وہ بھی سیاست کی طرح پیدائشی اور فطری قدر ہے۔ البتہ تعلیم اور تربیت سے اُس کی شکل و صورت میں حُسن ضرور پیدا ہوتا ہے۔ کتنے ان پڑھ لوگ ہیں جو معروف حکمران بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح خود نبی ﷺ اُمّی تھے اور یہ فخر کی بات تھی۔ اسی طرح کئی اہل روحانیت کو بھی علم لدنی عطا ہوتا ہے جو تمام علموں پر غالب ہے۔ اگرچہ ظاہری علوم کا بھی وافر حصہ ان کو عطا ہوتا ہے۔ کسی ادارے نے نہ کوئی سیاست دان پیدا کیا، نہ صاحبِ روحانیت۔ البتہ روحانیت ہو یا سیاست ہر دو کے لیئے یقین کے باعث اور یقین کے تناسب سے شخصیت میں نکھار آتا ہے۔

معروف بات ہے کہ ہنری کسنجر سے کسی اخبار والے نے پوچھا کہ امریکی صدر کے لیئے کیا بات ضروری ہے۔ اس نے برملا کہا ''تھوڑا سا علم اور یقین''۔ اس نے پوچھا کیا امریکی صدر کے لیئے تھوڑا سا علم کافی ہے۔ ہنری کسنجر نے کہا ''علم تو حاصل کیا جا سکتا ہے مگر یقین نہیں حاصل کیا جا سکتا''۔ اسی مثال پر شہنشاہ اکبر تھا کہ وہ بھی اُمّی تھا مگر اس کے دربار میں بہترین علم وفضل والے لوگ تھے۔

معاشرے میں فرد کی اہمیت

یہ اچھی طرح حق الیقین معلوم ہونا چاہیئے کہ حکمرانی ہو یا کوئی اور نظام ہو اس کا اصل اور بنیادی مدعا ومقصود فرد ہے۔ ہمارے ہاں اسی ایک امر کی سمجھ، شعور اور احساس نہیں ہے جس وجہ سے ترقی وتعمیر کے دریا بہا دینے کے باوجود ایک بے چینی بلکہ بے یقینی تسلسل سے چلی آ رہی ہے بلکہ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جب ہم فرد کی بات کرتے ہیں تو معلوم ہونا چاہیئے کہ کون سا فرد مراد ہے۔ کیا کروڑوں اور اربوں پتی، سمگلر اور لوٹ مار کرنے والا فرد مراد ہے۔ یقیناً نہیں۔ اس سے مراد وہ فرد ہے جو ضرورت کے لیئے پریشان ہے۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو ضرورت سے زائد کے لیئے پریشان ہیں۔ لیکن اہمیت اس فرد کی ہے جو ضرورت کے لیئے پریشان ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کے نزدیک بھی اہمیت اسی کی ہے کیوں کہ اس کا اللہ کے سوا کوئی اور سہارا نہیں ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مالک حقیقی کے قریب ہیں۔ یاد رکھیں کہ ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں بہا دیں تو ان کی کوئی حقیقت نہیں ہو گی جب تک اس مسکین شخص کو اعتماد نہیں ہوتا کہ وہ بھی اس معاشرے کا ایک معزز فرد ہے۔ اس بارے میں اللہ اور رسول ﷺ کے ارشادات کو بغور دیکھیئے اور اپنے کردار کو ٹٹولیئے۔ پھر اگر اللہ عمل کی توفیق دے تو اس کے اثرات کا بھی بغور جائزہ لیجیئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا'' (سورۃ التحریم، آیت ۶) ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو

آگ سے بچاؤ''۔ یہ خطاب فرد سے ہے کہ وہ اپنے آپ کو آگ سے بچائے اور پھر اپنے اہل وعیال کو۔ اگر غور سے دیکھیں تو یہی کل معاشرہ ہے۔ اب دیکھیئے کہ اس پر اللہ کے رسولﷺ نے کیسے عمل کیا۔ آپﷺ قریش کے اکابرین کے ایک وفد کو مسجد نبوی کی طرف لے کر جا رہے تھے تاکہ ان کو اسلام کی دعوت دیں۔ راستہ میں کسی بوڑھی خاتون نے آپﷺ کو روکا اور ایک طرف لے گئی۔ پھر نبی ﷺ کے ساتھ کافی دیر کھڑی رہی اور باتیں کرتی رہی۔ حضورﷺ جب وفد کے ساتھ مسجد شریف پہنچے اور اسلام کی دعوت دی تو اس وفد نے کہا کہ ہم تو پہلے ہی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ وہ جو آپﷺ اس مسکین بڑھیا کی بات سننے کے لیئے اتنی دیر کھڑے رہے۔ یہ بات کوئی نبی ہی کر سکتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر قرآن کریم نے ایک اور واقعہ کی نشاندھی سورۃ عبس میں کی ہے۔'' عَبَسَ وَ تَوَلّٰیo اَنْ جَآءَ ہُ الْاَعْمٰیo وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰیo اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰیo اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰیo فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰیo وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّکّٰیo وَاَمَّا مَنْ جَاءَ كَ یَسْعٰیo وَھُوَ یَخْشٰیo فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰیo (سورۃ عبس، آیت۱تا۱۰) ترجمہ: ''تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس وقت جب آپﷺ کے پاس ایک نابینا (عبداللہ بن مکتوم) آئے اور آپﷺ کو کیا خبر ہے کہ شاید اس کا تزکیہ ہو جاتا یا آپﷺ کی بات پر غور کرنے کے بعد سنور جاتا۔ وہ جو پرواہ نہیں کرتا سو آپﷺ اس کی فکر میں ہیں۔ اور آپﷺ پر کچھ الزام نہیں اگر ان کی اصلاح نہ ہو۔ اور وہ جو آپﷺ کے پاس آیا دوڑتا ہوا۔ اور وہ ڈرتا ہے سو آپ ﷺ اس سے بے پرواہی برتتے ہیں''۔ یعنی کہ نبیﷺ نے ایک اپنے چاہنے والے اندھے کی بات کو ناگوار محسوس کیا اور چہرہ مبارک پھیر لیا کیوں کہ آپﷺ قریش کے معززین کے وفد سے گفتگو فرما رہے تھے۔ اس پر یہ دس آیات نازل

ہوئیں جس سے فرد کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ ''آپ ﷺ سردارانِ قریش سے اسلام کے امور کے متعلق گفتگو فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک نابینا شخص جن کو ابن مکتوم کہتے ہیں، حاضر خدمت ہوئے اور اپنی طرف متوجہ کرنے لگے کہ فلاں آیت کیوں کر ہے۔ یا رسول اللہ ﷺ مجھے اس میں سے کچھ سکھایئے۔ آپ ﷺ کو اس کا بے وقت سوال کرنا گراں گزرا۔ آپ ﷺ کو خیال ہوا کہ میں ایک بڑے کام میں مشغول ہوں۔ قریش کے یہ بڑے سردار اگر ایمان لے آئیں تو اس سے اسلام کو بڑی تقویت حاصل ہو گی۔ اس کو دکھائی نہیں دیتا کہ میں کتنے اہم کام میں مشغول ہوں۔ ابن مکتوم تو بہرحال مسلمان ہیں ہی ان کو سمجھنے کے تو کئی مواقع حاصل ہیں۔ اس وجہ سے آپ ﷺ کے چہرۂ اقدس پر ناپسندیدگی کے آثار نمودار ہوئے جس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ عبس کی متذکرہ دس آیات نازل فرمائیں۔ اس واقعے کے بعد جب بھی ابن مکتومؓ آتے تو نبی ﷺ ان کی تعظیم و تکریم کے لیئے کھڑے ہو جاتے اور فرماتے یہ وہ شخص ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھے تنبیہہ فرمائی۔ ایک فرد کے بارے میں کیا اس سے بڑھ کر کوئی تاکید یا مثال ہوسکتی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ فرد کی اہمیت کو اہل مغرب نے تو اچھی طرح سمجھا اور اپنایا لیکن ہم بد نصیب لوگ نہ اس کو سمجھ سکے نہ اپنا سکے۔

فرد کی اہمیت کے بارے قرآن حکیم کا وہ ارشاد بھی قابلِ توجہ ہے جس میں ارشاد فرمایا: ''وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا'' ''اللہ تعالیٰ کے دربار لایزال میں قیامت کے دن تمام لوگ اکیلے اکیلے حاضر کیئے جائیں گے''۔ اس ارشاد سے بھی فرد کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر ارشاد فرمایا: ''مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى

بَنِیٓ اِسۡرَآءِ یۡلَ اَنَّهٗ مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَیۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِی الۡاَرۡضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیۡعًا ؕ وَمَنۡ اَحۡیَاهَا فَکَاَنَّمَاۤ اَحۡیَا النَّاسَ جَمِیۡعًا ﴿o﴾ ''اسی سبب سے لکھا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اُس نے سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو''۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جس نے بلاوجہ کسی ایک فرد کی جان کو ضائع کیا گویا اُس نے سارے جہاں کے امن و امان کو تہہ و بالا کر دیا۔ اس آیت سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ ایک فرد کے اطمینان سے سارے جہان کا اطمینان وابستہ ہے۔ اور ایک فرد کی بے اطمینانی سے سارے جہان کی بے اطمینانی وابستہ ہے۔ بالا دو آیات اور دیگر کئی آیات قرآنیہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ معاشرے میں امن و امان قائم کرنے کے لیئے بنیادی فکر فرد ہے۔

اسلامی تعلیمات میں فرد کے حقوق کو بنیاد بنا کر تمام انسانی حقوق کا چارٹر پیش کیا گیا ہے۔ فرمایا: ''خَیۡرُالنَّاسِ مَنۡ یَنفَعُ النَّاسَ'' ''کہ انسانوں میں سے بہترین فرد وہ ہے جو دیگر انسانوں کے لیئے نفع بخش ہو''۔ اس حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے فرد ہی کو فرد کے لیئے مفید قرار دیا ہے۔ چونکہ معاشرہ کی تعمیر فرد ہی سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں دوسری بنیاد قرآن کریم نے فراہم کی ہے۔ فرمایا: ''وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ'' ۔ اس کا مفہوم یہی بنتا ہے کہ جو فرد سوسائٹی کے لیئے مفید ہو وہی زمین پر باعزت و باوقار رہے گا۔ اور جو فرد کے لیئے مفید نہ ہو وہ زمین پر باقی نہیں رہے گا۔ اسلامی معاشرہ میں فرد کا جتنا احترام بیان کیا گیا اتنا کسی دیگر مذہب میں بیان نہیں کیا گیا۔

اہل مغرب کو یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے ہاں جانوروں کی دیکھ بھال بھی اسی شوق سے کرتے ہیں اور یہ کوئی راز نہیں ہے۔ ان کے ہاں کتنے ادارے ہیں جو صرف جانوروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ تعجب ہو گا یہ معلوم کر کے کہ یہ کام بھی ہمارے آقا نبیﷺ کی طرف منسوب ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ فتح مکہ کے دن جب آپﷺ صحابہؓ کی ایک عظیم جماعت کے ہمراہ مکہ کے اندر فاتحانہ انداز میں داخل ہوئے تو آپﷺ نے اچانک صحابہؓ کے سیلِ بے کراں کو رک جانے کا حکم فرمایا۔ صحابہؓ کو آپﷺ کے اس غیر معمولی حکم کے متعلق کچھ تشویش سی ہوئی بعض اکابر صحابہؓ کے استفسار پر آپﷺ نے وضاحت فرمائی کہ تمہارے راستے میں بلی اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی تھی اگر میں تمہیں رکنے کا حکم نہ دیتا تو تمہارے گھوڑوں کے قدموں کی چاپ سے وہ بلّی اور اس کے بچے ہلاک ہو جاتے۔ ایک اور واقعہ اس کبوتری کے انڈے دینے کا ہے جس نے نبیﷺ کے خیمے کے اندر انڈے دیئے ہوئے تھے۔ حضورﷺ نے سفر کرنا تھا مگر سفر مؤخر کر دیا جب تک وہ بچے نکال کر فارغ نہیں ہو گئی۔

آپﷺ کی اتباع کرنے والے صحابہ کرامؓ نے بھی اسی پر عمل کیا۔ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ اپنے قافلے کے ہمراہ تشریف لے جا رہے تھے کہ اچانک آپؓ کی نظر ایک عورت پر پڑی جس کا شیر خوار بچہ خیمے کے اندر رو رہا تھا۔ وہ عورت حضرت عمرؓ کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی کہ ''اللہ بُرا کرے عمرؓ کا جس نے بچوں کا وظیفہ مقرر کروانے کے لیئے شرط لگا رکھی ہے کہ جب تک بچہ دودھ نہیں چھوڑے گا اس وقت تک اس کا وظیفہ مقرر نہیں ہو گا''۔ یہ بات سن کر حضرت عمرؓ نے اپنے آپ کو کوسنا شروع کیا اور اس موقع پر ایک تاریخی بات ارشاد فرمائی ''نہ جانے اس عمر نے

کتنی ماؤں کے بچوں کو قتل کروا دیا ہے''۔ پھر آپؓ اس عورت سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ اپنے مجرم (عمر) کو شام تک کا موقع دیجیئے۔ شام کو آپؓ نے قانون میں ترمیم فرما دی اور حکم دیا کہ بچے کی پیدائش ہی سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ آج کل مغرب میں یہ تمام اصلاحات موجود ہیں جن کی بنیاد حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں رکھی اور پھر اسی بنیاد پر آپؓ نے فرمایا کہ اگر دجلہ کے کنارے کتا بھوکا مر گیا تو اس کا حساب بھی عمرؓ سے لیا جائے گا۔ کیا ہم مسلمان اور خاص کر حکمران جن میں درجہ بدرجہ ہر شخص شامل ہے جیسا کہ حضورﷺ کا ارشاد مبارک ہے'' کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ o ترجمہ ''تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور اس سے اپنی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا''۔ آپﷺ نے فرمایا کہ ''بعض لوگ پراگندہ بال اور غبار آلود کپڑوں والے اگر کسی سے رشتہ مانگیں تو کوئی نہ دے اور اگر سفارش کریں تو قبول نہ کی جائے لیکن اس کے باوجود اگر وہ اللہ کے نام پر قسم کھا لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو ضرور باالضرور پورا فرما دے''۔ ایک اور حدیث میں آپﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے اللہ پاک زمین پر بارش برساتے ہیں، لوگوں کے رزق میں فراخی فرماتے ہیں اور ان کی مصیبتوں میں کمی فرماتے ہیں''۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ مسجد نبوی میں اعتکاف فرما رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور ان سے کسی نجی کام کے حوالہ سے بات چیت کرنے لگا۔ آپؓ اس کا مدعا سننے کے بعد اس کے ہمراہ مطلوبہ جگہ پر تشریف لے گئے تو کسی نے پوچھا کہ اے عبداللہ بن عباسؓ آپ نے اعتکاف میں ایسا کیوں کیا؟ آپؓ نے نبیﷺ کی قبر اطہر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان صاحبِ قبر (نبیﷺ) سے میں نے سنا کہ ''جو شخص کسی مسلمان کی ایک شرعی حاجت کو پورا کرتا ہے اس کو اسی (۸۰) برس کے نفلی اعتکاف کے برابر

ثواب ملتا ہے''۔ ایک حدیث شریف میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''وَاللّٰہِ فِیْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا کَانَ الْعَبْدُ فِیْ عَوْنِ اَخِیْہِ o ترجمہ ''جب تک کوئی شخص کسی بھائی کی حاجت کو پورا کرنے کے لیئے کوشش میں لگا رہتا ہے تو اللہ پاک اُس کی حاجت کو پورا کرنے کے لیئے اسباب مہیا فرماتے رہتے ہیں''۔ اس سے بھی فرد کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرے کے اندر گرے پڑے لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے ہاں کتنا مقام ہے۔ اس لیئے کارِ حکمرانی میں اس انسانی پہلو کو اگر مقدم نہیں رکھا جا سکتا تو کم از کم اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ جو راتوں کو گشت فرماتے تھے تو وہ ترقی و تعمیر کا جائزہ لینے کے لیئے نہیں بلکہ کسی مسکین اور ضرورت مند کی تلاش میں ہوتے تھے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس تحریر کے قاری خاص کر ہماری جماعت سے تعلق رکھنے والے حضرات اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش ضرور کریں گے۔

اختتامیہ

حکمرانی اور پھر اچھی حکمرانی کا یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ کسی ایک کتاب میں اس کا مکمل احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اس لیئے میں نے قطع نظر فلسفہ و منطق کے ان چند اصولوں پر ہی اکتفا کیا ہے جو ہمیں روزمرّہ زندگی میں پیش آتے ہیں یا جن کے بغیر حکمرانی محض فساد در فساد تو ہوسکتی ہے مگر اچھی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح وہ تمام اصول و ضوابط جن کا میں نے ذکر کیا ہے وہ تقریباً وہی ہیں جن پر خود میں نے عمل کرنے کی کوشش کی یا کم از کم خواہش رہی کہ اُن پر عمل کر سکتا۔ تاہم اکثر و بیشتر امور وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے عمل کرنا بھی نصیب ہوا۔ میں نے اپنی کتاب ''مذاکرات سے مارشل لاء تک'' میں حکمرانی کے بارے میں چند باتوں کا ذکر کیا ہے۔ خاص طور پر یہ کہ کس طرح حکمرانی انسان کو اللہ تعالیٰ سے دور کر دیتی ہے۔ اپنی حکومت کے دوران میں یہ سمجھتا رہا کہ میری زندگی میں حکمرانی کا کوئی اثر نہیں ہے اور میں بدستور ٹھیک راستے پر ہوں۔ کسی کو میسر آئے تو اُس کتاب کا وہ باب ضرور پڑھے جس میں مذکور ہے کہ انسان کا نفس کس طرح اس کو دھوکے میں ڈالے رکھتا ہے۔ کوشش یہ کی ہے کہ کوئی بات ایسی نہ کہی یا کی جائے جو یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْن ''اے ایمان والو ایسی بات تم کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں'' کی زد میں آئے۔

سیاست میں جھوٹ، دغا اور فریب تو روزمرّہ ہے۔ بلکہ بعض حضرات تو فخر

سے کہتے ہیں کہ سیاست دغا اور فریب ہی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں مگر میں نے سیاست کو عبادت سمجھا ہے۔ یاد نہیں کہ دوچار مرتبہ کے علاوہ کبھی نماز کے وضو کے بغیر کسی میٹنگ یا جلسہ میں شریک ہوا ہوں۔ لوگوں سے بھی کہتا رہتا ہوں کہ قیامت کو پوچھا جائے گا کہ تم سب لوگ کیوں جمع ہوئے تھے اور مجھ سے بھی اسی طرح پوچھا جائے گا کہ میں نے لوگوں کو کیوں جمع کیا تھا۔ حساب کتاب تو بعد کی بات ہے مگر اس طرح طلبی سے تمام انبیاءؑ اور اولیاء بھی ڈرتے ہیں۔ کہنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے سیاسی لوگ اس بات کا خاص خیال رکھیں اور عام لوگ بھی اس امر سے غافل نہ ہوں۔ طلبی اور جوابدہی سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ الّا ماشاءَ اللہ۔ اس طلبی کے معاملے پر اگر اللہ تعالیٰ کے حبیبﷺ کا فرمان پڑھ لیا جائے اور یاد رکھا جائے تو پھر کچھ زیادہ تردّد نہیں ہوتا۔ آپﷺ اکثر نماز کے بعد دعا مانگتے تھے ''اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَاباً یَّسِیْرًا'' ترجمہ: اے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز میرا حساب کتاب آسان فرما دے''۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا یا رسول اللہﷺ آپﷺ حساب کی آسانی کیوں طلب فرماتے ہیں۔ آپﷺ نے فرمایا اے عائشہؓ قیامت کے دن جس کے حساب کتاب پر جرح ہوئی یا طلبی ہوئی وہ ہلاک ہو گیا۔ آپﷺ نے فرمایا ''مَنْ نُّوْقِشَ الْحِسَابَ فَقَدْ ھَلَكَ'' ترجمہ: قیامت کے دن جس کو حساب کے لیئے طلب کیا گیا وہ ہلاک ہو گیا''۔

میں ۱۹۷۱ء میں جب صدر بن گیا تو ایک صاحب علم ملازم کو میں نے بلوایا اور اس کو اپنا سیکرٹری مقرر کیا۔ اس نے بعد میں دوستوں کو بتایا کہ جب تک صدر نے مجھے بتایا نہیں کہ وہ مجھے سیکرٹری بنا رہے ہیں میرا دم گھٹ رہا تھا کہ خدا جانے

صدر نے کیوں طلبی کی ہے۔ اس سے قیامت کے دن کی طلبی کا اندازہ لگایا جائے کہ وہ کیا ہو گی جس کے بارے میں (دو جہاں کی رحمت) رحمۃ اللعالمین ﷺ کی آرزو تھی کہ حساب آسان ہو یعنی طلبی نہ ہو۔ تمام تر توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

ایک اچھے حکمران کے لیئے نہایت ہی مفید اور با مقصد امر یہ ہے کہ حکومت میں رہ کر نہ تو کسی کو مخالف سمجھے خواہ وہ مخالفت ہی کیوں نہ کرتا ہو اور نہ کسی کو چہیتا بنائے اگرچہ وہ تعریف ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ تجربہ بتاتا ہے کہ درحقیقت نہ تو کوئی مخالف ہے اور نہ کوئی چہیتا۔ وقت پر کئی ایک چہیتے بھی آنکھیں بدل لیتے ہیں۔ اور کئی ایک مخالف بھی دوست بن جاتے ہیں۔ یہ عین فطرتِ انسانی ہے اس لئے خواہ مخواہ اپنے آپ کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اسی طرح کسی سے وفاداری طلب نہ کرے۔ کیونکہ وفاداری طلب کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا ہے۔ البتہ توفیق ہو تو خود اپنی وفا کو قائم رکھے، چاہے بالکل یکطرفہ ہی کیوں نہ ہو۔ جس کی فطرت میں وفا ہے وہ تو بہر صورت وفا کرے گا۔ لیکن جس کی فطرت میں ہی وفا نہیں ہے اُس سے مطالبہ محض دھوکہ ہو گا۔ یاد رہے کہ وفا ایک قیمتی انسانی قدر ہے جو ہر ایک کو میسر نہیں۔ اس لیئے اپنے دل کو کدورت سے جس قدر پاک رکھے گا اتنا ہی اللہ کے ہاں پسندیدہ ہو گا بلکہ جنتی ہونے کی ایک بڑی علامت دل کو کدورت سے پاک رکھنا بھی ہے۔ کدورت زیادہ تر وفاداری کی امید ناکام ہونے کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ یوں بھی تین دن سے زیادہ کسی بھائی کے ساتھ ناراضگی جائز نہیں ہے۔ اس میں بھی ابدی حکمت ہے۔ اس ضمن میں حدیث مبارک ہے "لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلٰثَ" ترجمہ: کسی بھی

مسلمان کے لیئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ناراض رہے''۔ برائی سے لازماً پرہیز کرے مگر کسی کے بُرے عمل کے باعث اس شخص کو ہمیشہ برا سمجھنا درست نہیں ہے۔ اس لیئے کہ توبہ اور اصلاح کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا۔ تجربہ بھی یہی بتلاتا ہے۔ اس پر ایک طویل حدیث مبارک بھی ہے۔ تاہم اختصار کے نقطۂ نظر سے چند احادیث مبارکہ کا مفہوم ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے:

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کسی کے بُرے عمل پر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے اُس کے انجام کے بارے میں رائے زنی نہیں کرنی چاہیئے۔ اور اسی طرح کسی کی نیکیوں کو دیکھ کر حسنِ خاتمہ کی رائے نہیں دینی چاہیئے اور نہ ہی نیک اپنی نیکیوں پر غرور کرے۔ ممکن ہے بظاہر بُرے کا خاتمہ اچھا ہو جائے اور بظاہر نیک کا خاتمہ بُرا ہو''۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت کے قریب اگر صبح ایک شخص مسلمان ہو گا تو شام کو کافر ہو گا۔ اور شام کو مسلمان ہو گا تو صبح کافر ہو گا''۔

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''آدمی نیکی کے راستہ پر پورے خلوص کے ساتھ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ پھر اُس سے کوئی ایسا عمل سرزد ہو جاتا ہے کہ وہ جہنم میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی بُرائیاں کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جہنم کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ آخر میں اُس سے کوئی ایسا عمل سرزد ہو جاتا ہے جس کے باعث وہ جنت میں چلا جاتا ہے''۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، اچھی حکمرانی کے مکمل خدوخال کا احاطہ تو ممکن

نہیں تاہم اس سے متعلقہ اہم اصولی اور بنیادی امور کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ ان امور پر موجودہ دور میں سو فیصد عمل کرنا تو شاید ممکن نہ ہو لیکن جس درجہ میں بھی کوئی حکمران عمل کرے گا، اسی تناسب سے اچھی حکمرانی کے قریب تر ہو گا۔ یقین محکم کے ساتھ نیک نیتی سے عمل کی کوشش شرط ہے۔

کارِ حکومت کے حوالہ سے یہ بات تقریباً سب جانتے ہیں کہ حکومت کے تین بڑے ستون ہوتے ہیں جن میں ایک تو حکمران اور اس کے وزراء یعنی حکمرانی کا ادارہ ہے جو مل کر اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں جب کہ دوسرا ستون عدلیہ اور تیسرا جو سب سے اہم اور فعال ہے وہ انتظامیہ ہے۔ قانون سازی کا ادارہ بھی ایک اہم ستون سمجھا جاتا ہے لیکن اس کو علیحدہ بھی دیکھا جا سکتا ہے اور حکمرانی کا ادارہ بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ لہذا یہ بات حکمرانوں کے لیئے بہت اہم ہے کہ انتظامیہ کے اراکین کے ساتھ کوئی غلط فہمی نہ ہو بلکہ وہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یعنی حکمران افراد اور انتظامیہ کے افراد میں فکری و عملی ہم آہنگی ہو جو آج کل کیا بلکہ روز بروز بوجوہ مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ ہمارا فکری تضاد ہے۔ کہنے کو تو ہم بہت قومی مفاد کی بات کرتے ہیں لیکن انحطاط کے باعث اب بات محض ذاتی مفاد تک جا اٹکی ہے۔یہاں تک کہ ہمارے ہاں ذاتی مفادات کو ہی ملکی، قومی اور ملی تقاضوں پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ ملک و ملت بے چارے منہ تک رہے ہیں۔ اس ضمن میں دو باتیں مدِنظر رہنی چاہیئیں۔ ایک یہ کہ انتظامیہ حکم مانتی ہے یا نہیں۔ اس بارے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انتظامیہ آسانی سے حکم نہیں مانتی اور یہ کوئی بُری بات بھی نہیں ہے کیوں کہ وہ پہلے سے موجود ہوتے ہیں اور اپنے علم اور عمل کے لحاظ سے اپنے کام کے ماہر ہوتے ہیں جب کہ

حکمران کو یہ سہولت حاصل نہیں ہے۔ حکمران چاہے افلاطون ہی کیوں نہ ہو اس کو بھی کارِ حکومت سمجھنے میں کافی مشکل ہوتی ہے اور کافی وقت لگتا ہے۔ مصری حکمران جمال عبدالناصر نے چھ سال حکومت کرنے کے بعد کہا تھا کہ مجھے حکومت کی اب سمجھ آئی ہے۔ دوسرے معاملات کی طرح ہی کار حکومت کے لیئے بھی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہمارے ہاں اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بلکہ حکومت میں آجائے تو پھر عقل کُل ہو جاتا ہے اور اس طرح سیکھنے کے عمل سے محروم رہتا ہے۔ جب حکومت ختم ہو جاتی ہے تب اور وہ بھی خوش قسمت افراد کو سمجھ آتی ہے کہ انھوں نے اچھا یا غلط کیا کِیا ہے ورنہ وہ اپنی غلطیوں کو ہی صحیح سمجھتا رہتا ہے۔ اپنی غلطیوں سے سیکھنا بڑے دانشمند لوگوں کا کام ہے۔ ہر ایک کو یہ دولت نصیب نہیں ہوتی۔شاید اسی لیئے ترقی یافتہ اقوام میں ایک Shadow Cabinet کا نظام رائج ہے۔ بھارت میں مہاتما گاندھی جی نے 'واردھا' میں ایک ایسا ہی ادارہ قائم کیا تھا جس کے نتیجے میں بھارت میں آج تک سیاسی استحکام چلا آرہا ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ حکم ماننے کے ساتھ ساتھ انتظامیہ کے لوگ حکومت کے ساتھ تعاون بھی کریں۔ تعاون اور حکم ماننے میں جو فرق ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ''مجھے ایک دفعہ ضیاء الحق صاحب کی حکومت میں کراچی سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ یہ ایم۔ آر۔ڈی کا زمانہ تھا۔ متعلقہ ایس پی صبح صبح میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ'' آپ کے لیئے کراچی چھوڑنے کے احکامات ہیں''۔ میں نے پوچھا کہ یہ حکم کب جاری ہوا؟ اُس نے بتایا کہ کل شام کو۔ میں نے پوچھا ہمارے باقی لوگوں کا کیا ہوا کیوں کہ اور حضرات بھی تھے؟ تو اُس نے کہا وہ رات کو چلے گئے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ نے مجھے رات کو کیوں نہیں بتایا؟ اُس نے

کہا رات کو جانے میں آپ کو دقت ہوتی۔ آپ نے جانا تو تھا ہی اس لیئے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو رات کے وقت Disturb نہ کیا جائے''۔ یہ تو حکم ماننے اور تعاون کرنے کی مثال ہے۔ اب حکم ماننے اور تعاون نہ کرنے کی مثال دیکھیئے ''میں مظفرآباد جا رہا تھا۔ میں راستے میں اکثر بانسرہ گلی سے لارنس کالج کی طرف مُڑ جاتا ہوں۔ اس بار وہاں پولیس کے کچھ آفیسر کھڑے تھے۔ جب میں نے ڈرائیور کو مُڑ جانے کا اشارہ کیا تو ایک پولیس آفیسر نے میری گاڑی کے پاس آ کر اشارہ کیا اور کہنے لگا کہ آپ معروف راستے سے جائیں۔ اتنے میں کچھ مزید گاڑیاں آئیں جو لارنس کالج کی طرف مُڑ گئیں۔ میں بہت سوچتا رہا کہ آخر پولیس والے نے کیوں میرے ساتھ ایسا کیا۔ بعد میں پتا چلا کہ لارنس کالج میں صدر صاحب آئے ہوئے تھے اس لیئے پولیس والوں نے میرا لحاظ کیا اور مجھے معروف راستے پر موڑ دیا۔ لیکن جب دوسری گاڑیاں تین چار کلو میٹر سفر کر چکیں اور وہاں سے واپس مُڑنا پڑا تو وہ لوگ صدر صاحب کو بُرا بھلا کہتے ہوئے واپس مُڑے۔

کسی حکمران کو یہ گمان نہیں ہونا چاہیئے کہ چونکہ وہ حکمران ہے اس لیئے انتظامیہ کے لوگ خوش دلی سے اُس کا حکم بھی مانیں گے اور تعاون بھی کریں گے۔ انتظامیہ کو ایک نامعلوم احساس ہوتا ہے کہ اصل حکمران تو ہم ہیں یہ درمیان میں کون ہے۔ اور دوسرا یہ کہ قابل اور لائق انتظامیہ کی مثال ایک تربیت یافتہ اور اچھی نسل کے گھوڑے کی طرح ہوتی ہے کہ جب سوار اُس کے قریب آتا ہے تو گھوڑے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سواری جانتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ سوار نہیں ہے تو وہ اُس کو آسانی سے سواری نہیں کرنے دیتا۔ چنانچہ ہمارے ہاں اس کے علاج کے لیئے حکمرانوں اور سیاستدانوں نے ایک نیا راستہ نکالا کہ وہ بجائے سواری سیکھنے کے

گھوڑے کو مار مار کے ''ٹٹو'' بنا دیتے ہیں۔ گھوڑا نہیں رہنے دیتے۔ ہمارے ہاں روز اول سے ہی ایسا ہوتا رہا ہے۔پھر ایک بُری بات جو اس سے بھی بُری ہے وہ یہ ہے کہ بعض حکمران حکمرانی کی طیش میں انتظامیہ کے لوگوں کی عزت نفس مجروح کرتے ہیں۔ اُن کو عام مجلسوں میں بُرا بھلا کہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر سرکاری ملازم کو سزا مل جائے تو وہ اُس کو اتنا بُرا محسوس نہیں کرتا لیکن اگر اُس کی عزت نفس مجروح ہو تو وہ اُس کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

حضرت علیؓ جب امیر المومنین بنے تو اس ضمن میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ ایک صحابیؓ نے اُن سے عرض کیا کہ امیر المومنین جس طرح چاہیں کریں لیکن انتظامیہ کو نہیں چھیڑنا ہے۔ حضرت علیؓ نے تھوڑی سی ناراضگی سے فرمایا کہ ''کیا یہ لوگ جو ہمارے مخالفین کے ساتھ ملے ہوئے ہیں''؟ تو اُس صحابیؓ نے عرض کیا کہ اگر آپ ان کو نکالیں گے اور نئے لوگ لائیں گے تو وہ چونکہ کام سے واقف نہیں ہوں گے اس لیئے اُن کی نااہلیت آپ کے کھاتے میں پڑ جائے گی اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو یہ لوگ آپ کے خلاف سازشیں کریں گے اور حکومت کو ناکام کر دیں گے''۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ بعد میں ایسا ہی ہوا۔ انتظامیہ کا تعاون حاصل کرنے کے لیئے خود ایک بڑے انتظامی آفیسر نے کسی مشاورتی مجلس میں ضیاء الحق صاحب کو ایک بڑی حکیمانہ بات کہی۔ جب ضیاء الحق صاحب نے عدم تعاون کی شکایت کی اور ناراضگی کا اظہار کیا تو اُس آفیسر نے کہا کہ ''جنرل صاحب ہم تین طرح سے تعاون کر سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ کو عوام کی تائید حاصل ہو جو نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ آپ آئین اور قانون کی پابندی کریں۔ وہ بھی نہیں ہے کیوں کہ مارشل لاء ہے۔ اور تیسرا یہ کہ آپ علم و فضل میں ہم سے بہتر ہوں آپ وہ بھی

نہیں ہیں''۔

حکمرانی کے تین چار معروف طریقے ہیں۔ سب سے اعلیٰ طریقہ حکمرانی کے ادارے کے ساتھ مشاورت کا ہے۔ مگر مشاورت اُن کے ساتھ جو زیادہ بہتر علم رکھنے والے ہوں نہ کہ کم تر لوگ جیسا کہ عام رواج ہے۔ ایسی صورت میں حکمران کو کوئی خطرہ نہیں ہے جب کہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ حکمران اپنے سے علمی اعتبار سے کم تر کی تلاش میں ہوتے ہیں تاکہ ان کی زبان سے اپنے لیئے تعریفی کلمات سُن کر خوش ہو سکیں۔ مشاورت والے لوگ دانشمند، دانشور اور جرأتمند ہوں تاکہ حکومت پر تنقید کر سکیں اور حکمران اُن کی تنقید سے ایک تو ناراض نہ ہو اور دوسرا یہ کہ اُن کی تنقید میں صحیح اور درست بات کو تلاش کرے اور اُس پر عمل کرے۔

حکمرا نی کا ایک اور طریقہ ہے جو نسبتاً آسان ہے۔ وہ یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کے ذریعے حکومت کرے جسے Bureaucracy کہتے ہیں۔ سرکاری ملازم جو کہیں وہی کرے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ سرمایہ داروں کے ذریعے حکومت کرے جس کو Aristocracy کہتے ہیں۔ سرمایہ دار ہی پالیسی ساز ہوں اور جو وہ کہیں وہی کرے بلکہ حکومت کا مقصد ہی سرمایہ دار ہوں۔ اس کے علاوہ دنیا میں خاندانی حکمرانی بھی رہی اور آج بھی کہیں کہیں موجود ہے جس میں حکومت کے بڑے عہدے اُس خاندان کے لوگوں کو ہی دیئے جاتے ہیں۔ تاہم اگر حکمرانی کا یہ خاندانی ادارہ اچھے، صاحب علم و دانشور افراد پر مشتمل ہو گا تو وہ حکومت مستحکم ہو گی ورنہ خرابی کا باعث ہو جائے گی۔ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایران میں ساسانی خاندان کی حکومت عرصہ تک رہی۔ حکومت کو جب زوال ہوا تو آخری تاجدار سے ایک دانشمند شخص نے زوال کا سبب پوچھا تو اُس نے کہا ''ہم رات کو دیر تک

شراب پیتے اور جاگتے تھے اور صبح کو دیر تک سوتے رہتے تھے''۔

قرآن کریم نے بھی رومیوں کی حکومت کے زوال اور پھر فاتح ہونے کی تاریخی مثال دی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا '' کہ جو رومی ہیں وہ مغلوب ہو جائیں گے اور پھر چند سالوں میں غالب آجائیں گے۔'' وہ بھی شراب کے عادی تھے اور جب اس سے ہٹے تو اُن کو فتح ہو گئی۔ اسی طرح ایک حکومت وہ ہے جس کو عوامی حکومت کہتے ہیں۔ عوامی حکمرانی وہ ہے جس میں عوام کی قدر و منزلت ہو اور اُن کے معاملے میں اُن کی رائے کو اہمیت دی جائے۔ عوام کے بارے میں عوام کی رائے کا احترام کرنا بے حد اہمیت کا حامل ہے اور نہایت مئوثر بھی۔ ہمارے کئی حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ عوام بے چارے اس قابل کہاں ہوتے ہیں کہ اُن سے مشورہ کیا جائے۔ لیکن تمام تر تجربات بتاتے ہیں کہ عوام کے معاملات میں اُن ہی کا مشورہ صائب ہوتا ہے اور اس طرح اُن کو احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی حکومت میں شریک ہیں۔ اس سے حکومت میں استحکام بھی پیدا ہوتا ہے۔

اس سارے قضیئے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی صاحبِ علم جو تاریخ کا ادراک رکھتا ہو ہمت کر کے پاکستان میں حکومتوں کے بناؤ اور بگاڑ کے اسباب کو پوری دیانت اور غیرجانبداری سے قلمبند کر لے تا کہ موجودہ بھی اور آنے والی نسلوں کے لیئے بھی رہنمائی اور ہدایت کا کچھ مواد مہیا ہو جائے۔ سرِدست ایک ایسی بنیادی خرابی کی طرف ہی توجہ دلاتا ہوں جو میرے خیال میں ہمارے ہاں تمام خرابیوں کی بنیاد ہے۔ ایک تو میں نے مرحوم سہروردی کے حوالے سے بات کی ہے جس کی رُو سے ہر آنے والے حکمران کی اولین اور مذہبی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے سے پہلے کے حکمران نے جو کچھ کیا ہو اُس کو برباد کر دے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر حکمران کی ذہنی، فکری و انتظامی صلاحیتں انتقام کا شکار ہوگئیں۔ دوسرے یہ

کہ اس سے پہلے کہ وہ کوئی مثبت بات کر سکتا اگر وہ بھی چاہتا تو اس کی حکومت اولاً تو ختم ہو گئی یا کم از کم متزلزل اور غیر مستحکم ہو گئی۔ ستم یہ بھی ہے کہ ایک منفی ذہن تیار ہو گیا۔ یہاں تک کہ مثبت بات کرنا ہی خارج از امکان ہو گیا۔ ۱۹۴۸ء میں جب آزادکشمیر میں پہلی حکومت قائم ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ حالات درست سمت پر نہیں جا رہے۔ ایک پرانے اور بڑے لائق وزیر خزانہ تھے میں نے اُن سے پوچھا ! شاہ جی آپ لوگ ڈوگرہ راج کے خلاف بڑی تقریریں کرتے تھے مگر اب جب کہ آپ کی حکومت ہے آپ کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہیں لا سکے۔ کہنے لگے ''سچی بات بتاؤں'' میں نے کہا بتایئے۔ کہنے لگے ''ہم نے اپنی عمر کا بہترین حصہ حکومت کی مخالفت میں گزارا ہے۔ اب مثبت کام کی سمجھ ہی نہیں آ رہی ہے''۔ ہمارا یہ عزیز وطن پوری طرح اسی کارکردگی کا مظہر ہے۔ ہر پارٹی کا اپنا ایک جھنڈا ہے اور ایک اپنا ایجنڈا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ یہ سب ایک دوسرے سے نہ صرف متضاد ہیں بلکہ مخالف بھی ہیں۔ کوئی حکیم بتائے کہ ان میں سے کس کا ایجنڈا نافذ ہو سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر افسوسناک یہ ہے کہ کوئی ایک دوسرے کے ساتھ مفاہمت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ نتیجہ لا محالہ یہ ہے کہ آج جھنڈوں اور ایجنڈوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ حد یہ ہے کہ مذہبی جماعتوں اور سیکولر جماعتوں میں نہ صرف جماعتی اختلاف ہے بلکہ ان کے اپنے مابین گروہی اختلاف اسلام اور کفر کی طرح ہے۔ اسی طرح جو سیکولر جماعتیں ہیں ان کے اپنے مابین اقتدار کی ہوس کی حکمرانی ہے۔ کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو دوسرے کی بات کو اہمیت دیتا ہو۔ البتہ ایک تخریبی بات پر سب متفق ہو جاتے ہیں کہ بس اس شخص کو اتارو۔ کسی کے پاس کہنے کو یہ نہیں ہے کہ فلاں کو بناؤ۔ ہر شخص اور جماعت کا اسلام اپنی قسم کا ہے جس میں کسی دوسرے کے لیئے گنجائش نہیں ہے اور اسی طرح سیکولر جماعتوں کا حال ہے۔ ایک

اور بات جو شاید کسی دوسرے ملک میں نہیں ہے وہ یہ کہ جماعتیں اور ان کے ایجنڈے کوئی ادارہ نہیں بلکہ محض افراد ترتیب دیتے ہیں۔ جو بات کسی ایک فرد کو پسند ہے وہی صحیح ہے۔ ایسی حالت میں بے چارہ پاکستان تو محض ایک یتیم خانہ بن کے رہ گیا ہے۔ اولاً کسی جماعت کے ایجنڈے میں پاکستان کے داخلی و خارجی حالات کی موافقت میں کوئی قابلِ عمل تذکرہ نہیں ہے۔ اگر کچھ ہو بھی تو اس جماعت کے دعووں اور عمل میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ ایسے میں درد رکھنے والے محبِ وطن احباب سے وطن عزیز کی سلامتی کے لیئے دعاؤں کی درخواست ہی کی جا سکتی ہے۔

اپنی بات کو ختم کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال نوازش اور فضل سے ہمیں ملکِ پاکستان عطا کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم نے اللہ تعالیٰ کی اس عظیم مہربانی اور گراں مایہ نعمت کا شکر ادا کیا؟ اس وقت ملک کے اندر ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں یہ سب ہماری ناشُکری کی سزا ہے۔ اس عذاب سے جو اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کی ناشُکری کا نتیجہ ہے بچنے کا ایک ہی علاج ہے کہ خاص و عام سب اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر عاجزی اور انکساری سے کفرانِ نعمت کے ارتکاب پر معافی مانگیں، نوافل ادا کریں اور استغفار کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کے قہر اور ناراضگی سے بچ سکیں اور ان کو دی گئی یہ خاص نعمت ملک پاکستان رہتی دنیا تک سلامت رہے اور اسلامی دنیا کی ترقی و خوشحالی میں اپنا فعال کردار ادا کرنے کا اہل ہو۔ اللہ تعالیٰ اہلیانِ پاکستان اور پاکستان کا حامی و ناصر ہو اور اہلیانِ کشمیر و پاکستان کے لازوال رشتے کو مستقبل میں بھی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند مضبوط و مستحکم رکھے اور یہاں کے مکینوں کو اچھی حکمرانی میں سانس لینا نصیب ہو۔

خلاصہ

گو کہ اچھی حکمرانی سے متعلق آیاتِ قرآنی، احادیث مبارکہ، اقوال صحابہؓ اور بعض دوسرے اہل علم و نظر اور حکمرانوں کے تجربات کی روشنی میں اس کتاب کے متن میں تفصیل سے بات کی گئی ہے، تاہم بعض باتیں اسلامی نقطۂ نظر کے باوتود بھی ایسی ہیں کہ جن میں سے خواہ کسی ایک پر بھی کوئی بھی شخص عمل کرے تو اچھی حکمرانی کے مقاصد بہت حد تک پورے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس غرض کے لیئے کتاب کے آخر میں خلاصے کے طور پر یہ چند باتیں لکھ دی ہیں۔ اور ان میں سے ہر بات اس سے جو بذات خود ایک کتاب کا متن رکھتی ہے۔ اور ان باتوں کی مناسب تشریحات اس کتاب کے متن میں شامل کر دی گئی ہیں۔ اور سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ ان پر عقائد کے ساتھ عمل کیا جائے اور اگر کوئی بے عقیدہ شخص بھی ان پر عمل کرے گا تو اُس کو بھی اس کا بھرپور فائدہ ہو گا۔

۱: یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ o کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَاتَفْعَلُوْنَ۔ ''اے ایمان والو ایسی بات تم کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں ہو''۔ اسی کے مطابق حضورﷺ کا ارشاد ہے کہ اور غلطیوں کے علاوہ مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ یہ وہ ایک بنیادی بات ہے جو اپنے اندر تمام انسانی اعمال کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ گویا اس کو انسانی اعمال کا مرکزی نقطہ کہہ سکتے ہیں۔

۲: ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَاِنَّ ذَالِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُورِ o ''اور جس نے صبر کیا اور درگزر کیا تو یہ بہت بڑے معاملات میں سے ہے''۔ اور اس میں درج بالا آیت کی طرح اللہ تعالیٰ نے کسی مذہب یا مکتبۂ فکر کی کوئی قید نہیں لگائی۔ صبر کی تمام قسمیں اپنی جگہ بہت اہم ہے لیکن ظاہر ہے کہ صبر ناپسندیدہ چیزوں پر ہی ہو سکتا ہے کیوں کہ پسندیدہ امور پر صبر کرنے کی فضیلت نہیں ہے۔ سوائے نفسانی خواہشات کے اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى o فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى o ''اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کی خواہش کو روکا اس کا ٹھکانا جنت ہے''۔ ذاتی پسند ناپسند بھی دل میں خواہشاتِ نفس کا دخل ہے۔ اسی قسم میں سیاسیات بھی ایک اہم معاملہ ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی کسی ناپسندیدہ بات پر کسی ردِعمل کا اظہار نہ کرے اور یہی بہت مشکل امر ہے جب کہ یہی مفید ترین عمل ہے۔ جو شخص سیاسیات میں ردِعمل کا اظہار کرتا ہے تو گویا وہ اُس عمل کے ماتحت ہو جاتا ہے۔ جس پر وہ ردِعمل کا اظہار کر رہا ہے۔ مثلاً کسی نے بُرا کہا خاموشی کے سوا اُس کا جو بھی جواب دے گا گویا وہ اپنا نقصان کرے گا اور فائدہ مخالف شخص کو ہو گا۔ اگر کوئی شخص صرف اسی ایک بات پر عمل کرنا شروع کر دے تو اس کی زندگی کے تمام معاملات درست ہو جائیں گے درج بالا آیت کا سب سے مؤثر مفہوم یہی ہے۔

۳: اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ سے ارشاد فرمایا: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ o ''اے رسولﷺ! اپنے رفیقوں سے مشورہ کریں''۔ پھر دوسرے مقام پر فرمایا: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ o ''یہ لوگ اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے

کرتے ہیں''۔ پہلی آیت کی طرح ان آیات کا فائدہ بھی عالمگیر ہے اور ہزاروں لاکھوں انسانوں کے تجربات سے ثابت ہے۔

۴: حکمرانی کے تین چار معروف طریقوں میں سب سے اعلیٰ طریقہ حکمرانی کے ادارے کے ساتھ مشاورت کا ہے۔ مگر مشاورت اُن کے ساتھ جو زیادہ بہتر علم رکھنے والے ہوں۔ کیوں کہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض حکمران اپنے سے کم علم لوگوں کے ساتھ مشورہ کرنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں یا سرے سے مشورے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے مشورہ کیا حالانکہ اُن کو کسی مشورے کی ضرورت نہیں تھی۔ گویا مشورہ کرنا ایک ابدی اصول ہے۔

۵: سائل کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا کہ ''وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ''۔ ''اور سوال کرنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کر''۔ کسی فارسی شاعر نے کیا خوب کہا: ''مظلوموں کی آہ سے ڈرو کہ بدُعا کرتے وقت درحق سے قبولیت استقبال کرتی ہے''۔

۶: قرآن کریم میں ارشاد ہے:وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسُ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ۔ ''اور جو لوگ انسانوں کے لیئے فائدہ مند ہیں وہی زمین پر باقی رہیں گے''۔ حکمران یا کوئی بھی شخص جو اپنے آپ کو انسانوں کے لیئے مفید بنائے گا اُسے اس کا فائدہ ملے گا۔ اس ضمن میں حاتم طائی کی مثال اہم ہے اور اسی طرح مدرٹریسا کو بھی پوری دنیا اسی وجہ سے جانتی ہے۔

۷: حضورﷺ کا ارشاد ہے: ''خَيْرُالنَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسِ۔''لوگوں میں بہتر وہ ہے جو انسانوں کے لیئے فائدہ مند ہے''۔ پھر فرمایا: ''كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ

مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ o ''تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور اس سے اپنی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا''۔ اس سے بڑھ کر انسانی حقوق کا چارٹر اور کیا ہو گا۔ اس ضمن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَآ قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ط وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا o ''اسی سبب سے لکھا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اُس نے سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو''۔

۸: حدیث مبارک ہے: ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْكِهِمْ''۔ ''لوگ اپنے حکمرانوں (بادشاہوں) کے دین پر ہوتے ہیں''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمرانوں کے کردار سے رعایا خود بخود متاثر ہوتی ہے۔

۹: ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ ''اور غصہ کو پی جانے والوں اور لوگوں کو معاف کرنے والوں اور احسان کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے''۔ اسی طرح انسان کی ایک بُری خصلت شخصی انتقام لینا ہے۔ درج بالا آیات کے مطابق اس سے درگزر کرنا انسانیت کی ایک اعلیٰ صفت ہے۔

۱۰: قرآن حکیم نے غیبت کرنے کو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی ہے۔ اور حدیث مبارک ہے کہ: اَلْغِیْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا ''غیبت زنا سے زیادہ بڑا گناہ ہے''۔ اس لیئے حکمران کو چاہیئے کہ وہ اپنے کسی حامی یا مخالف کی